انتخاب مضامین

فکر تونسوی

مرتبہ

دلیپ سنگھ

اتر پردیش اردو اکادمی
لکھنؤ

سلسلۂ مطبوعات: ۲۵۷

انتخاب مضامین

فکر تونسوی

مرتبہ

دلیپ سنگھ

اترپردیش اردو اکادمی

لکھنؤ

انتخاب مضامین فکر تونسوی

مرتبہ دلیپ سنگھ

پہلا ایڈیشن	۲۸ر فروری ۱۹۸۸
تعداد	ایک ہزار
قیمت	نو روپے

رام کرشن ورما سکریٹری اترپردیش اردو اکادمی نے آفسیٹ پریس گورکھپور سے چھپوا کر بلہرہ ہاؤس، قیصر باغ، لکھنؤ ۱ سے شائع کیا۔

پیش لفظ

مزاح صرف ایک افتادِ طبع نہیں بلکہ یہ ایک ایسا اسلوبِ بیان ہے جس کی کیفیت تقسیم در تقسیم کا شکار ہوتی رہی ہے۔ یہی کیفیت کبھی مسخرا اور پھکڑپن کا مظہر بن جاتی ہے اور کبھی طنز و تعریض کی غمازی کرتی ہے۔ انتخابِ الفاظ میں اگر فنکار سے چوک ہو گئی تو طنز دشنام طرازی کا مرقع بن جاتا ہے۔ طنز میں طبیعت کو بھی سنبھالنا پڑتا ہے اور الفاظ کو بھی اور جسے طبیعت و الفاظ کو قابو میں رکھنے کا سلیقہ آتا ہے، وہی اچھا طنز نگار ثابت ہوتا ہے، جو لوگ مزاحیہ ادب کو ادبِ عالیہ میں شمار نہیں کرتے، ان کی مراد مزاح کے اُن نمونوں سے ہوتی ہے جن میں گفتار کا اسلوب عامیانہ ہو جاتا ہے۔

اردو نثر میں طنز و مزاح کے متنوع نمونے ملتے ہیں اور ان میں بعض نمونے ایسے ہیں جو اردو کو طرۂ امتیاز عطا کرتے ہیں۔ فکر تونسوی کی تحریریں اسی ذیل میں آتی ہیں۔

اس عظیم طنز نگار کے مضامین کا کوئی جامع انتخاب دستیاب نہیں ہے جو امتحانات کے نصاب میں شامل ہو سکے یا عام قاری کے ذوق کو تحقیق و تفحص کے خارزاروں سے محفوظ رکھ سکے۔ اکادمی کی درخواست پر جناب دلیپ سنگھ نے مضامین فکر تونسوی کا جامع انتخاب مرتب کیا اور اس پر خیال انگیز مقدمہ لکھا۔ اکادمی موصوف کا شکریہ ادا کرتی ہے۔

امید ہے کہ اکادمی کی دوسری مطبوعات کی طرح انتخاب مضامینِ فکر تونسوی کو بھی حسنِ قبول ملے گا۔

اتر پردیش اردو اکادمی
قیصر باغ، لکھنؤ۔
۱۲، فروری ۱۹۸۳ء

محمود الٰہی
چیرمین، مجلسِ انتظامیہ

ترتیب

مقدمہ

فکرؔ تونسوی کا طنز و مزاح کی سلطنت میں داخلہ اور اس کا تخت و تاج اُسے کچھ اِس طرح نصیب ہوا جیسے پُرانے زمانے میں کوئی نووارد کسی شہر میں اچانک داخل ہوتا تھا اور اہلِ شہر اُس کے سر پر تاج رکھ دیتے تھے۔ فکرؔ نے اپنی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ طنز نگاری اُنھوں نے شروع کی تھی غمِ روزگار کو بہلانے کے لیے۔ اور اس بہلاوے نے اُسے اتنی شہرت بخشی کہ آج لوگوں کو یاد دلانا پڑتا ہے کہ کبھی وہ شاعر بلکہ بہت اچھا شاعر تھا۔

فکرؔ کی شہرت کی کہانی بھی عام ادیبوں سے مختلف ہے۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کسی نے کچھ اچھی نظمیں یا کہانیاں لکھیں اور ناقدین نے مضامین لکھ لکھ کر قارئین کا دھیان اُس کی ادبی صلاحیتوں کی طرف دلایا۔ اس طرح وہ ادیب عوام میں مقبول ہو گیا۔ فکرؔ کا معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ وہ اپنے مضامین اور اخباری کالموں کی وجہ سے عوام میں اتنا مقبول ہوا کہ ناقدین کو خیال ہوا کہ اُس پر اگر انھوں نے مضامین نہ لکھے تو لوگ شاید انھیں ناقد ماننے سے انکار کر دیں۔ فکرؔ نے طنز و مزاح کے میدان میں وہ جوہر دکھائے کہ اس کے قارئین اُس کو طنز و مزاح کا شہنشاہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔

فکرؔ کو اپنی زندگی میں بے شمار اعزازات ملے اور بے شمار ایسے اعزازات

نہیں ملے جن کا وہ یقیناً حق دار تھا۔ لیکن میرا یقین ہے کہ ستائش یا صلہ اُس کی زندگی یا ادب پر کوئی نمایاں فرق پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کی اپنے قارئین میں بے پناہ مقبولیت کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے وہی زندگی جی جس کا وہ داستان گو بنا۔ بہت کم لوگوں کو یہ صلاحیت عطا ہوتی ہے کہ اس دنیا میں رہ کر وہ نہ صرف دوسروں کے اندر جھانک سکیں بلکہ خود کو اس طرح بے نقاب کر سکیں کہ بدن پر سے چمڑی تک اُتر جائے۔ فکرؔ اُن بہت ہی کم لوگوں میں سے ایک تھا۔ اس نے اپنی آپ بیتی میں جس فکر کی رونمائی کی ہے شاید وہ کوئی دشمن بھی نہ کر سکتا۔ آپ بیتی میں قریباً تین چوتھائی جھوٹ کی ملاوٹ کا بُرا نہیں مانا جاتا۔ لیکن فکرؔ نے اس تسلیم شدہ حق کا بھی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ اس نے اپنے ایک مضمون "قبر سے واپسی" میں ایک ایسے جلسے کا ذکر کیا ہے جو اُس کی فرضی موت کے بعد اُس کی یاد میں کیا گیا۔ فکرؔ کی دور بینی اور شخص آشنائی کی اس سے بہتر کیا مثال دی جا سکتی ہے کہ فکرؔ کی حقیقی موت کے بعد جو تعزیتی جلسے ہوئے اُن میں اکثر جلسوں میں مجھے احساس ہوا کہ لوگ وہی تقاریر کر رہے ہیں جن کی امید فکرؔ ان سے کیے ہوئے تھا۔

فکرؔ اگرچہ کسی سیاسی جماعت کا رُکن نہیں تھا، لیکن اُس کے دماغ میں ایک ایسے نظام کا نقشہ ضرور تھا جس میں انسانی زندگی پنپ سکتی ہے۔ اُسے اس بات کا بھی شدّت سے احساس تھا کہ قارئین اُس کے مضامین سے لطف اندوز تو ہو رہے ہیں، مستفید نہیں ہو رہے۔ مجھے یاد ہے ایک بار جامعہ ملیہ کے ماس کمیونی کیشن ڈیپارٹمنٹ کے صدر نے کچھ ادیبوں کو بُلوا کر اُن سے درخواست کی تھی کہ ہم لوگ دیہات سدھار کے مسئلہ پر کچھ پروگرام لکھیں۔ فکرؔ نے وہاں بیٹھے بآواز بلند کہا کہ میں نہیں لکھوں گا۔ صدر صاحب نے قدرے متعجب ہو کر پوچھا۔ "فکر صاحب ایسا کیوں؟"۔ فکرؔ نے جواب دیا، "پہلے جو اتنا لکھ چکا ہوں اُس پر کون سا عمل ہو رہا ہے۔"

فکرؔ کی ادبی صلاحیتوں کا اِس سے بہتر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اُس نے

اخبار کے کالموں کو ادبی شان عطا کی اور سیاسی طنز کو بامِ عروج تک لے آیا۔
طبقاتی کش مکش کی بات تو ہر سیاست دان کرتا ہے۔ لیکن فکرؔ نے اس کرب کو جس سطح پر محسوس کیا، کسی اور نے نہیں کیا۔ ظفر پیامی صاحب نے ایک جلسے میں ایک ڈرامے کا ذکر کیا جو انھوں نے ریڈیو پر سُنا تھا۔ ڈرامے میں چپراسی کمرے کے باہر اسٹول پر بیٹھا مونگ پھلیاں کھا رہا تھا اور اُس کا صاحب اندر کمرے میں کرسی پر بیٹھا چلغوزے کھا رہا تھا۔ مصنف کا نام جانے بغیر اُن کا اندازہ صحیح نکلا کہ اِس ڈرامے کا مصنّف ضرور فکرؔ تونسوی ہوگا۔ ایک بار میں نے اُسے بتایا کہ اُس کے محلے میں ایک دھنوان اُس کا مداح ہے اور اُس سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ "وہ اُسی دودھ والے سے دودھ لیتا ہے جس سے تم لیتے ہو۔" فکرؔ نے کہا، "یہ وہی شخص تو نہیں جو روزانہ دو سیر دودھ لے رہا ہوتا ہے جب میں پاؤ سیر دودھ لینے جاتا ہوں؟" فکر کو اُس شخص کو پہچاننے میں اس لیے دقت نہیں ہوئی کیوں کہ وہ زندگی بھر "دو سیر دودھ" لینے والوں کے خلاف نبرد آزما رہا۔

فکرؔ کو اپنی زندگی میں بے حد شہرت ملی۔ لیکن اُس نے کبھی اس کا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ میری اس سے تیس سال کے اوپر کی دوستی تھی۔ کبھی میں نے اُسے اپنی شہرت کے کندھے پر بیٹھ کر اپنا قد اونچا کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

فکرؔ نے اُردو میں لکھنا شروع کیا۔ تقسیمِ مُلک کے بعد جب اردو کے کئی اور ادیبوں نے زیادہ معاوضے کی خواہش میں دوسری زبانوں کی طرف رجوع کیا، فکرؔ اردو سے ہی جُڑا رہا۔ اُردو زبان کے لیے فخر کی بات ہے کہ فکرؔ کی ادبی صلاحیت کی وجہ سے فکرؔ کی شہرت کم ہونے کی بجائے اردو کا نام بلند ہوا۔

میں نے اس کتاب کے لیے فکر کے نو مضامین، ناول کا ایک باب،

آپ بیتی کا ایک اقتباس، ایک خاکہ اور دو اخباری کالم منتخب کیے ہیں۔ مضامین کا انتخاب مشکل تھا لیکن میرے لیے آسان اس طرح ہو گیا کہ فکر کی زندگی میں ہم دونوں نے مل کر اُس کے کچھ مضامین منتخب کیے تھے انھیں ڈرامائی شکل دینے کے لیے۔ یہ مضامین گویا خود فکرؔ کے پسندیدہ ہیں۔ ناول اور آپ بیتی کے اقتباس میری ذاتی پسند کا نتیجہ ہیں۔ فکرؔ نے ۱۹۵۰ میں بہت سے ادیبوں کے خاکے لکھے تھے جو اُس کی کتاب "خدوخال" میں شامل ہیں۔ ۱۹۵۰ کے بعد اس نے بہت کم خاکے لکھے۔ میں نے اُس کا لکھا ہوا محمور جالندھری کا خاکہ اس کتاب میں محض اس لیے شامل کیا ہے تاکہ قارئین اُس کی اس صلاحیت کو بھی محسوس کر سکیں۔ اُس کے بے شمار اخباری کالموں میں سے میں نے صرف دو اس لیے اِس کتاب میں شامل کیے ہیں کہ اُس کی ادبی شہرت کا اِن کالموں سے گہرا رشتہ تھا۔ فکرؔ نے لاتعداد ریڈیو ڈرامے اور ٹاکس لکھی ہیں۔ لیکن میں نے اُن میں کوئی ڈرامہ یا ٹاک اِس کتاب میں شامل نہیں کی کیوں کہ فکرؔ نے کبھی انھیں ادبی سطح پر نہیں رکھا۔ حالاں کہ میں اس بات میں اُس سے متفق نہیں ہوں۔

میں جناب پروفیسر محمود الہٰی صاحب چیرمین اتر پردیش اردو اکادمی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے اِس انتخاب کو تیار کرنے کی خوش گوار ذمہ داری سونپی۔ میں امید کرتا ہوں کہ میں اِس ذمہ داری کو اُن کی اور فکرؔ کے پرستاروں کی امیدوں تک نبھا پایا ہوں۔

دلیپ سنگھ

۵۹/۴ راجندر نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۶۰

۱۱ جنوری ۱۹۸۸

مضامین فکر تونسوی

مَن کہ...

[فکر تونسوی کے خودنوشت حالاتِ زندگی]

نام[1]: (والدین کا عطیہ) : نارائن

نامِ مُبردہ (خودساختہ) : فکرؔ تونسوی

تاریخِ پیدائش : ۷؍اکتوبر ۱۹۱۸ (پہلی جنگِ عظیم میں)

تاریخِ وفات : تیسری جنگِ عظیم میں۔

مقامِ پیدائش : شجاع آباد ضلع ملتان (غیر آبائی گاؤں)

آبائی گاؤں : تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازی خان (حالیہ پاکستان)

والد کا نام : دھنپت رائے

والد کا پیشہ : کوہ سلیمان کے بلوچ قبائل میں تجارت اور طب۔

والد کی وفات : جوئے بازی کی خصلت نے عالمِ عسرت اور فاقہ کشی تک پہنچا دیا۔ بزعم خود بلوچ قبائل سے ہزار ہا روپے واجب الوصول تھے۔ لہٰذا ایک دن خستہ حال بہی کھاتہ دیکھتے دیکھتے انتقال فرما گئے۔ سن ۱۹۲۵ء میں۔

میری تعلیم : (۱) گورنمنٹ ہائی اسکول تونسہ شریف۔ میٹرک پاس۔ جماعت میں فرسٹ۔

---

[1] اسکولی نام : رام لال

۲۔ والد صاحب بلوچ قبائل والی دُکان پر تجارت کی طرف راغب کر کے لے گئے، مگر ایک سال میں ہی تجارت سے دل اُچاٹ ہو گیا۔

۳۔ ایمرسن کالج، ملتان میں ایک سال تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد مجبوراً ترکِ تعلیم کا سامنا کرنا پڑا۔ کیوں کہ گھر والوں نے اپنے مالی وسائل کی کم ظرفی کے باعث مزید تعلیم کے اخراجات ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ بے بسی کا یہ سن ۱۹۳۶ء تھا۔ بے بسی اور بغاوت کا۔

اپنی پُشت پر:

اقتصادی پس ماندگی کا سارا بوجھ چھ برس تک اپنی پُشت پر اُٹھانا پڑا۔ کئی پیشے اختیار کیے۔ ٹیچری، خوش نویسی، تاجروں کی ایجنسی، گھٹیا اور سستے اخباروں کی ایڈیٹری وغیرہ۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک۔

ادبی زندگی کا آغاز:

۱۔ یہ آغاز اسکول میں تعلیم کے دَوران پیدا ہو گیا تھا۔ غزلیں قلم بند کرتا رہا۔ چھوٹے چھوٹے میگزینوں اور اخباروں میں شائع ہوتی رہیں۔

۲۔ مگر سنجیدہ آغاز ۱۹۴۲ء میں اس وقت ہوا جب میری ایک نظم "تنہائی" مولانا صلاح الدین احمد کے موقر میگزین "ادبی دنیا" میں شائع کر دی گئی اور لاہور کے مشہور ادبی سنگٹھن "حلقۂ اربابِ ذوق" نے اُسے سال کی بہترین نظم ڈکلیر کر دیا۔

۳۔ ۱۹۴۳ء کے آغاز میں ترقی پسند ادبی تحریک کے نمائندہ ترجمان پبلشر مکتبہ اردو لاہور اور ادبِ لطیف سے وابستگی اختیار کی۔

۴۔ اور پھر معروف ادبی رسائل "ادبِ لطیف"، "ہمایوں"، "ادبی دنیا" میں میری نظموں کی پے بہ پے اشاعت شروع ہو گئی۔

۵۔ ۱۹۴۵ء میں ممتاز مفتی اور میری مشترکہ ادارت میں ایک طرزِ نو کا ادبی دو ماہی میگزین "سویرا" شائع ہوا۔ جس نے بڑے بڑے ادبی رسائل کو چونکا دیا۔

۶۔ ۱۹۴۶ء میں ایک مرتبہ پھر ماہنامہ "ادبِ لطیف" کی ادارت کی ذمّہ داری سنبھال لی جو ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات کے باعث آگے نہ چل سکی اور مجھے بطور رفیوجی ہندوستان میں آنا پڑا۔

پہلی تصنیف:

۱۔ ۱۹۴۷ء میں ہی میری نظموں کا پہلا مجموعہ "ہیولے" کے نام سے مکتبہ اُردو نے ہی شائع کیا جو فسادات کے سبب زیادہ پبلسٹی حاصل نہ کر سکا۔ فسادات کی نذر ہو گیا۔

۲۔ فسادات کے بعد شاعری ترک کر دی۔ کیونکہ عام سوجھ بوجھ سے مختلف شاعری تھی اور آزادی کے بعد میرا رابطہ عوام کے مسائل سے زیادہ ہوتا گیا، اس لیے مزاح اور طنز میں نثر تحریر کرنا شروع کر دی جو عوام کو سمجھ بھی آگئی اور پسند بھی۔

دوسری تصانیف:

۱۔ سب سے پہلی نثریہ تصنیف "چھٹا دریا"، تحریر کی جو فسادات پر ایک دردناک ڈائری کے فارم میں تھی ــــ ۱۹۴۹ء

۲۔ بہ سلسلۂ فسادات ایک کتاب "ساتواں شاستر"، قلم بند کی۔ ۱۹۵۱ء۔ اُس کے بعد تصانیف کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا، جن کا ذریعۂ اظہار صرف طنز و مزاح تھا۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۷ء تک مندرجہ ذیل ۱۶ تصانیف شائع ہو چکی ہیں جو طنز و مزاح کے مضامین پر مشتمل ہیں:

(۱) تیرِ نیم کش (۱۹۵۳ء)۔ (۲) پروفیسر بُدھو (۱۹۵۴ء)۔ (۳) ماڈرن الہ دین (۱۹۵۵ء)۔ (۴) خدوخال (۱۹۵۵ء)۔ (۵) ساتواں شاستر (۱۹۵۶ء)۔ (۶) ہم ہندوستانی (ہندی) (۱۹۵۷ء)۔ (۷) بدنام کتاب (۱۹۵۸ء)۔ (۸) آدھا آدمی (۱۹۵۹ء)۔ (۹) آخری کتاب (۱۹۶۱ء)۔ (۱۰) فکرنامہ (۱۹۶۶ء)۔ (۱۱) پیاز کے چھلکے (۱۹۷۲ء)۔ (۱۲) چھلکے ہی چھلکے (۱۹۷۳ء)۔ (۱۳) فکر بانی (۱۹۸۲ء)۔ (۱۴) گھر میں چور (۱۹۸۳ء)۔ (۱۵) مَیں (آپ بیتی حصہ اوّل) (۱۹۸۷ء)۔ (۱۶) میری بیوی (آپ بیتی دوسرا حصہ) (۱۹۸۷ء)

دیگر ادبی اور علمی سرگرمیاں:

۱۔ کالم نگاری نمبر ــــــ ۱۹۸۵ ۔ اردو میں ایک سو سالہ کالم نگاری پر رسالہ "چنگاری" کا ایک ضخیم نمبر مرتّب کیا۔

۲۔ دہلی میں دو بہت بڑے تین ایکٹ کیے دو اسٹیج ڈرامے تحریر کیے جو دہلی کے ایک تھیٹر پر نہایت مقبول ہوئے۔

۱۔ دربارِ اکبری

۲۔ گاندھی شتابدی (یہ پورے کا پورا منظوم اسٹیج ڈرامہ تھا)

۳۔ دہلی کے مستند ادبی رسالہ 'شاہراہ' کی دو سال تک ادارت کی ۵۷-۱۹۵۶ء

۴۔ ریڈیو اسٹیشن جالندھر اور دہلی پر سینکڑوں ڈرامے، ڈراپچے، فیچر اور تقریریں کیں۔

۵۔ ٹیلی ویژن پر پانچ ڈرامے پیش کیے۔ پسند کیے گئے۔

۶۔ میرا ایک ریڈیائی ڈرامہ "آج کا سچ" تو ہندوستان کے ہر ریڈیو اسٹیشن نے براڈ کاسٹ کیا۔

۷۔ ایک ادبی میگزین "رفتار" کے نام سے جالندھر سے جاری کیا جو مالی ذرائع کی کمی کا شکار ہو کر بند ہو گیا۔

میری کالم نگاری:

۱۔ ۱۹۵۴ء سے کمیونسٹ پارٹی کی پنجاب برانچ نے روزنامہ "نیا زمانہ" شروع کیا جس میں روزانہ ایک طنزیہ کالم "آج کی خبر" کے نام سے شروع کیا جو خاصا مقبول ہوا۔

۲۔ "نیا زمانہ" بند ہوا اور میں نے ۱۹۵۶ء میں دہلی کے روزنامہ "ملاپ" میں "پیاز کے چھلکے" کے نام سے روزانہ تحریر کرنا شروع کیا اور ۲۵ برس تک لکھتا رہا۔ جسے ہندوستان کے قریب کسی بھی اردو تعلیم یافتہ کو آج تک نہیں بھولتا۔

سیاست:

۱۹۵۴ء سے سیاست میں دلچسپی لینا شروع کی۔ بائیں بازو کے رجحان کے باعث کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا فُل ٹائم ممبر بن گیا۔ مگر یہ ممبری تین چار سال سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اگرچہ مارکسزم ابھی تک میرے قلم اور سوچ پر مسلّط ہے۔

انعامات و اعزازات:

۱۔ پنجاب سرکار کی طرف سے اعزازی عطیہ۔ ایک ہزار روپے۔ ۱۹۵۶ء
۲۔ یو پی اردو اکیڈیمی۔ میری تصنیف "بدنام کتاب" پر ایوارڈ۔ ۱۹۵۹ء[۱]
۳۔ یو پی اردو اکیڈیمی۔ میری تصنیف: "فکرنامہ" پر ایوارڈ۔ ۱۹۶۹ء[۲]
۴۔ سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ۔ میری ادبی خدمات پر ایوارڈ۔ ۱۹۶۹ء
۵۔ میر اکاڈمی ایوارڈ۔ ۱۹۸۳ء
۶۔ بنگال اردو اکادمی۔ میری کتاب "فکر بانی" پر ایوارڈ۔ ۱۹۸۵ء
۷۔ دہلی ہندی ساہتیہ سرودر۔ ادبی اعزاز اور شال ۱۹۸۵ء
۸۔ بھاشا وبھاگ پنجاب۔ ادبی ایوارڈ اور شال ۱۹۸۷ء
۹۔ غالب ایوارڈ، دہلی۔ ادبی ایوارڈ ۱۹۸۷ء

[بشکریہ "آجکل"، نئی دہلی]

---

۱ و ۲ فکرؔ کو کسی وجہ سے تسامح ہُوا ہے۔ اتر پردیش اردو اکادمی نے ان کی مندرجۂ ذیل تین کتابوں پر انعام دیے ہیں۔
۱۔ چوپٹ راجہ (۱۹۷۳) ۲۔ فکرنامہ (۱۹۷۷) ۳۔ آخری کتاب (۱۹۸۰)

بیویوں کی ٹریڈ یونین

چند دن ہوئے میں رات کو جب گھر لوٹا۔ اور مردانہ روایت کے مطابق دیر سے لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری پہلی اور آخری بیگم نے اپنے گورے گورے کندھے پر ایک سیاہ بِلّہ لگا رکھا ہے۔ میں نے عرض کیا:

"یہ کیا ہے حضور؟"

وہ بولی:

"جھنڈا اونچا رہے ہمارا"۔

میرا ماتھا ٹھنکا کہ آج دال میں کالا ہے۔ چاند سا چہرہ جو کل تک رشکِ بتاں تھا، آج کسی انجمن خدام وطن کا پوسٹر معلوم دے رہا تھا جس پر تحریر تھا:

"اٹھو، مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو"

میں نے کچھ مسکرا کر (اور کچھ ڈر کر) کہا "اے انقلاب زندہ باد! کھانا لے آؤ"۔

وہ اپنی سڈول باہوں کو کسی جھنڈے کی طرح لہرا کر بولی، "آج کھانا نہیں ملے گا، آج چولھا ڈاؤن اسٹرائیک ہے"۔

شبہ یقین میں بدلنے لگا کہ معاملہ گمبھیر ہے اور اب بیگم کے ساتھ رومانٹک

گفتگو کرنا فضول ہے۔ یہ کس ستم گر نے گھر پر انقلابی چھاپا مارا ہے کہ آج محترمہ کی آنکھوں میں کاجل کی تحریر کی بجائے مطالبات کا چارٹر دکھائی دیتا ہے۔ معاملے کی سنجیدگی کو دیکھ کر میں نے بھی اپنا لب و لہجہ بدل دیا اور مالکانہ وقار کے ساتھ کہا:
"بیگم تمھیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تم میری بیوی ہو۔"
تڑاق سے جواب آیا۔ "ہاں مگر میں ایک ورکر بھی ہوں اور آپ میرے مالک ہیں اور میری محنت کا استحصال کرتے ہیں۔"
"مگر ڈارلنگ!" ۔ میں نے پھر اپنا لہجہ بدل لیا۔ "مالک تو تم ہو، میرے دل و جان کی مالک، اس سلطنت کی تم نواب واجد علی شاہ ہو۔ بتاؤ ہو کہ نہیں؟"
ایک دن پہلے تک میرا یہی فقرہ طلسم ہوشربا کا کام کر جاتا تھا اور بیگم تڑپ کر میرے بازوؤں میں آ گرتی تھی۔ لیکن آج آغوش میں آنے کی بجائے اس نے اپنی نرم و نازک مٹھی دکھائی اور میز پر مارتے ہوئے بولی:
"سیٹھ جی! لچھے دار لفظوں کے یہ چھلاوے اب نہیں چلیں گے۔ صدیوں سے ظلم کی چکّی میں پستی ہوئی بیویاں اب بیدار ہو چکی ہیں۔ اور اب تو اپنے حقوق منوا کر دم لیں گی اور . . . . جو ہم سے ٹکرائے گا چور چور ہو جائے گا۔"
میں نے کہا۔ "کیا آج ہمارے گھر میں کوئی ترقی پسند شاعر آیا تھا؟"
وہ بولی۔ "شاعر میرے اندر سویا ہوا تھا۔ آج جاگ اٹھا ہے۔ لہذا میرے مطالبات مانیے نہیں تو . . . ."
"کون سے مطالبات . . . ؟"
"سب سے پہلے"، بیگم نے حلق میں تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں گھنگروؤں کی مانوس جھنکار نہیں تھی۔ بلکہ طبل جنگ کی سی گھن گرج تھی: "سب سے پہلے میرا مطالبہ یہ ہے کہ میرے کام کے اوقات گھٹائے جائیں، صبح پانچ سے رات کے گیارہ بجے تک اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرتی ہوں، انھیں کم کر کے نو گھنٹے کیے جائیں، ہر مہذّب سماج میں یہی دستور رہے۔"

"مگر ڈارلنگ یہ تو ہندوستانی سماج ہے۔"

وہ بھڑک اٹھی۔ "اور بائی دی وے جب تک مطالبات کی گفتگو جاری رہے آپ مجھے ڈارلنگ کے لقب سے مخاطب نہ کریں۔ ہاں تو ہندوستانی سماج کو مہذب بنانے کے لیے نو گھنٹے کے اوقات آپ کو منظور ہیں؟"

میں نے کہا "دیکھو (ڈارلنگ نہیں) ورکر بیگم! گھر میں اگر صرف نو گھنٹے کام ہو تو اس سے پروڈکشن پر بُرا اثر پڑے گا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کام کی دو شفٹیں کرنا پڑیں گی۔ دو شفٹیں اور دو بیویاں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں اسی گھر میں دوسری بیوی لے آؤں؟"

سوتن کا جلاپا عورت کی نازک رگ ہے۔ میں نے اس رگ پر جان بوجھ کر انگلی رکھ دی کہ ٹریڈ یونین کے اندر انتشار پیدا ہو جائے۔ مگر بیگم کے اندر جیسے وہ قدیم حاسد عورت مر چکی تھی۔ وہ بولی:

"یہ مالک کی اپنی پرابلم ہے۔ آپ چاہیں تو کوئی ملازمہ رکھ سکتے ہیں۔"

بیگم سوتن والے پہلو سے صاف بچ کر نکل گئی۔ اس کی یہ چیز آئی میرے لیے پریشان کُن تھی۔ چنانچہ میں نے ایک اور ہتھیار نکالا۔

"مگر اُسے تنخواہ کہاں سے دیں گے؟ جتنی تنخواہ ملتی ہے تمھارے گورے گورے ہاتھوں پر لا کر رکھ دیتا ہوں۔ تم چاہو تو اس تنخواہ میں سے ملازمہ رکھ سکتی ہو۔"

"اس تنخواہ میں ملازمہ نہیں رکھی جا سکتی۔"

"تو پھر کیا کیا جائے۔"

"میں نے کہا نا؟ یہ مالک کی اپنی پرابلم ہے اسے خود سوچنا چاہیے۔"

"آل رائٹ۔" میں نے تنگ آکر کہا۔ "مینیجمنٹ اس پر ہمدردانہ غور کرے گا اب اگلا مطالبہ پیش کیا جائے۔"

"دوسرا مطالبہ چھٹیوں کا ہے۔"

"مستقل چھٹی کا؟ اس کی تو میں کئی بار پیش کش کر چکا ہوں۔ مگر ہر بار تم نے

اسے حقارت سے ٹھکرا دیا۔"

"دیکھیے آپ اسے مذاق میں مت ٹالیے (حالاں کہ اللہ قسم یہ مذاق بالکل نہیں تھا) ہندوستان بھر کے سارے کامگاروں کو اتوار کی ہفتہ وار چھٹی ملتی ہے مگر مجھے اتوار کو سب سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر اتوار کو آپ کے احباب آدھمکتے ہیں۔ کوئی لنچ کھانے اور کوئی ڈنر اور کوئی یوں ہی گھومتے گھماتے چائے پینے آٹپکتا ہے۔ دیوالی، دسہرہ، عید، بقرعید کوئی چھٹی بھی تو نہیں ملتی ہے۔ نہ میڈیکل چھٹی نہ ایمرجنسی چھٹی۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔

میں بھی رونا چاہتا تھا مگر منیجمنٹ میں رونے کا رواج نہیں تھا۔

مطالبہ (خدا جھوٹ نہ بلوائے) بالکل جائز تھا۔ لیکن منیجمنٹ کا رویہ بھی اس کے متعلق بڑا واضح تھا کہ کسی بھی مطالبے کو جائز قرار نہ دیا جائے۔ بلکہ اگر مطالبہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو اسے اس کی بجائے احسان کا درجہ دیا جائے۔ چنانچہ میں نے کہا۔

"دیکھو بیگم! عورت ذات کی تاریخ گواہ ہے کہ اسے موت سے پہلے چھٹی نہیں ملتی۔"

"لیکن میں تاریخ کا دھارا موڑنا چاہتی ہوں۔"

"میری پیاری ہٹلر! اگر تم عقل کا تھوڑا سا بھی استعمال کرو تو تمھیں معلوم ہوگا کہ سماج کی تاریخ کا سارا ڈھانچہ عورت کے کندھے پر کھڑا ہے۔ جس دن بھی عورت نے چھٹی کی سماج میں ایک تعطّل آجائے گا۔ بھائیں بھائیں کرتی ہوئی ایک ویرانی گھر پر مسلّط ہو جائے گی۔ سارا کام اس روز چوپٹ ہو جائے گا، یوں لگے گا، فیکٹری پر جبری تالہ بندی کرا دی گئی ہے۔ بچّے روئیں گے، میں روؤں گا، گھر کی بلّی اور طوطا اور چوہا سبھی روئیں گے۔ میں پوچھتا ہوں، تمھاری چھٹی کے دوران کام کون کرے گا؟"

"آپ کیجیے گا۔" جذبات سے بالکل عاری ہو رہی تھی ظالم!

اب میں نے پینترا بدلا اور کہا۔ "اچھا چلو میں تمہاری ہفتے وار چھٹی منظور کرتا ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس چھٹی پر تم کرو گی کیا؟"

"بس بیٹھوں رہوں گی، سوئی رہوں گی، سہیلیوں کے ساتھ گھومنے جاؤں گی، فلم دیکھوں گی۔"

لب و لہجہ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ بیگم صرف میری نقل کرنا چاہتی ہے اور جنل بالکل نہیں ہے۔ ایک بار دل میں یہ شیطانی خیال بھی آیا کہ اسے اوور ٹائم کا لالچ دے دوں یعنی چھٹی کے دن کام کرو تو دوگنی اجرت ملے گی۔ اوور ٹائم کی رقم جمع کر کے ایک ساڑھی خرید لینا لیکن بیوی کو اوور ٹائم کی ترازو پر تولنا کچھ اچھا نہیں لگا۔ لہٰذا میں نے مردانہ فراخ دلی کی انتہائی بلندی پر کھڑے ہو کر آواز دی:

"ویکلی چھٹی منظور کی جاتی ہے۔ مگر ایک شرط یہ کہ تم اس دن بال بچّوں کو ہمراہ لے کر میکے چلی جایا کرو۔"

میکے کے پیچ پر بیگم کچھ بوکھلا گئی۔ میکہ ہر عورت کی کمزوری ہے۔ میکے کے سامنے سارا ٹریڈ یونین ازم منتشر ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بیگم کی سمجھ میں یہ بات فوراً نہیں آئی کہ اس کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا ہے یا مطالبہ کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا گیا ہے۔ مطالبے کے ساتھ شرط کی پیچ لگا کر میں نے ایک تیر سے دو شکار کر لیے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس سے بیگم بھی خوش ہو جائے گی اور میں بھی۔ بیگم کی غیر حاضری میں خاوند کو جو آزادی نصیب ہو جاتی ہے اس کا اندازہ صرف وہی شادی شدہ مرد لگا سکتے ہیں جو ایک مستقل یکسانیت سے نالاں رہتے ہیں۔

بیگم نے زیرِ لب تبسّم سے اس فیصلہ پر صاد کیا اور میں نے دل ہی دل میں خوش ہو کر کہا کہ:

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

بیگم کا تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ گھر کے اخراجات کے لیے اسے جو رقم دی جاتی ہے اس میں اضافہ کیا جائے۔ کیونکہ اشیا کے پُرانے نرخ قائم نہیں رہے ہر چیز پہلے کے مقابلے پر دوگنی مہنگی ہو گئی ہے۔ مگر اخراجات کی رقم بدستور وہی ہے۔

گویا یہ مہنگائی الاؤنس کا مطالبہ تھا جو بیک وقت جائز اور ناجائز تھا۔ میں نے جھٹ کہا۔

"بیگم! مجھے تمھارے اس مطالبے سے ہمدردی ہے، بلکہ صرف ہمدردی ہے۔"

وہ تڑپ اٹھی۔ "مگر ہمدردی سے تو بنیائن بھی نہیں آسکتی۔"

"تو بنیائن نہ خریدو۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ روکھی سوکھی روٹی کھا کے ٹھنڈا پانی پی۔ تو اس کا کچھ مطلب تھا۔ کچھ فلاسفی تھی۔ افسوس یہ ہے بیگم! کہ تم ٹریڈ یونین ازم کے جوش میں بزرگوں کی فلاسفی بھول گئیں۔"

اس کے جواب میں بیگم نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ بہت اذیت ناک تھا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ روکھے سوکھے کی فلاسفی پر یقین نہیں رکھتی وہ معیارِ زندگی کو گرا کر محلے میں اپنی ناک کٹوانا نہیں چاہتی۔ اس نے آنسوؤں کا ہتھیار نکال کر مجھ پر بار بار حملے کیے اور دھمکی دی: "گھر کے اخراجات کی ذمہ داری تم خود سنبھال لو خالی خولی ہمدردی اور بزرگوں کی فلاسفی کے ساتھ تم ایک ہفتہ میں ہی دیوالیہ نہ بن گئے، تو میں بیگم کہلانا چھوڑ دوں گی۔"

"تو پھر میں کیا کروں ڈارلنگ؟ جتنی آمدنی ہے اس سے زیادہ کہاں سے لاؤں؟"

"اپنی آمدنی بڑھاؤ۔" انقلابی بیوی نے نعرہ لگایا۔

"کیسے؟"

"رشوت لو، جیب کتری شروع کر دو، اسمگل کیا ہوا مال بیچو۔ کوئی پرمٹ

لائسنس لے لو، ساری دنیا اسی طرح ترقی کر رہی ہے۔"

اور میرا جواب یہ تھا کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔ گزشتہ ایک سو برس سے جو خاندانی شرافت ہمارے سر پر سایہ کیے ہوئے ہے۔ میں اسے چند کرسیوں، اناج کے چند دانوں، بنیانوں اور آلو گوبھی کی خاطر تباہ و برباد نہیں کر سکتا۔

مگر بیگم مصر تھی۔ "ہر دور میں اخلاق اور شرافت کی قدریں بدلتی رہتی ہیں، اخراجات میں کمی کر دینا بزدلی ہے، اور بزدل انسان کو کسی معزز بیوی کا خاوند بننے کا کوئی حق نہیں۔ اس لیے میرا یہ مطالبہ مان لو ورنہ جنرل اسٹرائیک کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

اس نے مجھے بزدل کہا۔ میرے شوہر پن کو مشکوک قرار دیا۔ جنرل اسٹرائیک کی دھمکی دے کر گھر کے مفاد پر ضرب لگانے کا اعلان کیا۔ یہ رویہ سیدھا طلاق کی منزل کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ مگر میں نے بھی تہیہ کر لیا کہ بیوی کو طلاق دے دوں گا خاندانی اخلاق کو نہیں دوں گا۔

چند منٹ کی بحرانی خاموشی کے بعد بولی:

"تو کیا ارادے ہیں؟"

"مطالبہ رد کیا جاتا ہے۔" میں نے تاریخ انسانیت کا عظیم ترین اعلان کیا۔

"لیکن یہ میرا بنیادی مطالبہ ہے۔ اگر اسے رد کیا گیا تو میں اس پر غور کروں گی کہ پہلے دو مطالبے بھی منظور کروں یا نہ کروں؟"

"مجھے یہ چیلنج منظور ہے۔"

اس مرحلے پر آکر سمجھوتے کی بات چیت ٹوٹ گئی۔ مصلحت کے تحت بیگم پلنگ پر جا بیٹھی۔ خصلت کے مطابق میں یوں ہی کوئی پرانا رسالہ اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ گھڑی کی ٹک ٹک ہمارے غم اور مسرت دونوں کو پیچھے چھوڑ کر وقت کی بے نیاز منزلیں طے کرتی رہی۔ میں نے کھانا نہیں کھایا۔ شاید بیگم نے بھی نہیں کھایا اور پھر یوں لگا کہ جیسے ہم دونوں ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ دور ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید ہم اندر ہی اندر روتے روتے سو گئے تھے، کھو گئے تھے۔

اور پھر جب بھوک کے گھڑیاں نے دو بجائے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک گرم گرم آنسو میری پیشانی پر آگرا ہے اور پھر ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز اور نرم و نازک ہاتھوں کا مس اور چوڑیوں کی مترنم جھنکار۔

"یہ کون تھا؟"

یہ کوئی ٹریڈ یونین لیڈر تو نہیں تھا۔

یہ کوئی انقلابی بھی نہیں تھا۔

یہ میری اکلوتی، پہلی اور آخری بیگم تھی! جو کہہ رہی تھی۔

"اٹھو، کھانا کھا لو۔ مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔"

وَر کے لیے کنّیا کی ضرورت

یہ اشتہار ہمیں آج سے دس سال پہلے دینا چاہیے تھا لیکن ان دنوں وَر یعنی برخوردار علمی چند "دنیا کے عظیم ہیرو" نامی کتاب پڑھنے میں مصروف تھا اور کہتا تھا، "جب تک لائبریری میں یہ کتاب موجود ہے میں شادی نہیں کراؤں گا۔"

اور اب جب کہ ہم یہ اشتہار دے رہے ہیں۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ بلکہ لائبریری میں اس کا تازہ ایڈیشن بھی آگیا ہے۔ مگر اس کے باوجود، برخوردار علمی چند شادی پر آمادہ ہوگیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اب اسے رات کو ڈراؤنے خواب آنے لگے ہیں بلکہ کئی بار تو خواب میں آسمان پر اڑتے اُڑتے بحر اوقیانوس میں جا گرا ہے۔

برخوردار علمی چند کا قد ٹھگنا ہے اس لیے وہ بلند خیالات کا مالک ہے۔ اونچے پایہ کے انسانوں میں بیٹھ کر بتاتا ہے کہ ہمارے اندر کون کون سی خرابیاں ہیں۔ علمی چند میں یہ بلند خیالی ان دنوں پیدا ہوئی، جن دنوں فوٹو گرافروں نے یہ پروپیگنڈہ شروع کیا تھا کہ فوٹو کھنچواتے وقت مسکرانا ضرور چاہیے۔ دراصل وہ ہندوستان کی بیداری کا زمانہ تھا، ہر ہندوستانی کو شک گزرتا تھا کہ ہندوستان بیدار ہو رہا ہے۔ لیکن شرم اور ڈر کے مارے کوئی کسی کو بتاتا نہیں تھا۔ مگر علمی چند ڈر

تھا۔ وہ بلا جھجک ہندوستان کی بیداری کا اظہار کر دیا کرتا بلکہ اس بیداری کے سلسلے میں یہاں تک کہہ دیتا کہ میرا باپ نہایت رذیل اور لالچی بڈھا ہے جو میری شادی کروا کر ہندوستان کا مستقبل تباہ کرنا چاہتا ہے۔

غرض ان دنوں علمی چند کے خیالات بے حد انقلابی تھے اور اُس کی باتیں سُن سُن کر وہی لُطف آتا تھا جو شیو کرنے کے بعد رخساروں پر ہاتھ پھیرنے سے آتا ہے۔

باوجود کوتاہ قامتی کے علمی چند ایک با اصول انسان ہے۔ (ہے نہیں، تھا) مثلاً اُس کا فارمولا تھا کہ اگر شادی کے بغیر تخلیق آدم پر حرف آتا ہو تو پھر کنیا ایسی لینی چاہیے جس کا قد، مجھ سے ایک فٹ کم ہو۔۔۔ لیکن بعد کی تحقیق و تفتیش سے معلوم ہوا کہ علمی چند سے ایک فٹ چھوٹے قد کی کنیا دنیا میں نایاب ہے۔ دو چار ایسی کنیائیں دستیاب ضرور ہوئی تھیں۔ لیکن بقول علمی چند وہ "پرسنلیٹی" سے محروم تھیں۔ حُسن کے اُن اصولوں پر پوری نہیں اترتی تھیں، جس کا ذکر شاستروں اور وید منتروں میں آیا ہے۔

مگر اب علمی چند کا اصول ہے کہ اصول نسبتاً لچکیلے ہونے چاہئیں۔ جن شاستروں اور وید منتروں میں علمی چند کے قد کا ذکر نہیں آیا وہ ماڈرن سوشل سائنس کے تقاضوں پر پورے نہیں اُترتے، اس لیے ماڈرن سوشل سائنس کی روشنی میں ہم ایسی کنیا بھی قبول کرلیں گے جس کا قد علمی چند کے قد کے برابر ہو۔ اس سے کم یا زیادہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اصول کو اتنا زیادہ لچکیلا بھی نہیں بنایا جاسکتا.

شادی کے متعلق برخوردار علمی چند کے کچھ اور اصول بھی تھے، جو اُسے یوں مرغوب تھے جیسے اُسے اپنی تصویر کا پُرانا فریم اور جامع مسجد کے کباب مرغوب تھے لیکن جب مارکیٹ میں جدید ڈیزائن کے خوب صورت فریم آگئے اور جامع مسجد کے کباب مہنگے ہوگئے تو علمی چند رو دیا اور اُس کے آنسوؤں میں تمام اصول دُھندلا گئے، اور آج صرف ان کی یاد باقی ہے، اُن کی دھند باقی ہے۔ اُن کی فغاں باقی ہے اور فغاں کا

کوئی اصول نہیں ہوتا۔

اشتہار دیتے وقت علمی چند چالیس کے پیٹے میں ہے۔ اُس کے کچھ بال سفید ہو چکے ہیں اور کچھ بال اُڑ چکے ہیں۔ جوں ہی اس کی کوئی محبوبہ شادی کرتی علمی چند کے کچھ بال یا تو اُڑ جاتے یا سفید ہو جاتے اور اب اُس کے اندر ایک ایسی فسردگی آ چکی ہے، جیسے شادی کے دس سال بعد کسی خاوند میں آ جاتی ہے۔ خاوند کی سی فسردگی پا کر اب وہ خاوند بھی بن جانا چاہتا ہے۔ اور یہ بھی چاہتا ہے کہ جس کنیا سے بیاہ کرے، وہ کم از کم اس کی حسرتوں کی داد ضرور دے، وہ کم از کم یہ ضرور محسوس کرے کہ اس قبر کے نیچے کتنا عظیم الشان مردہ دفن ہے۔

علمی چند تعلیم یافتہ آدمی ہے اور ایم۔ اے میں دو مرتبہ فیل ہو چکا ہے۔ ایک مرتبہ تو وہ اُس لیے فیل ہو گیا تھا کیونکہ وہ اپنی ایک کلاس فیلو لڑکی سے رومانس کر رہا تھا۔ فیل ہونے کی وجہ بعد میں صحیح نہیں نکلی، کیوں کہ وہ لڑکی ایم۔ اے میں پاس ہو گئی تھی۔ یہ نہیں ہوتا کہ ممتحن ایک کو فیل کر دے اور دوسرے کو پاس۔ محبّت سچی ہو تو اس کے اثرات یکساں ہوتے ہیں۔ لیکن علمی چند کا بیان ہے کہ وہ لڑکی چوں کہ بیوہ تھی، اس لیے دور اندیش تھی اور وہ بیک وقت محبّت بھی کرتی تھی اور پڑھائی بھی۔ بہر کیف کچھ بھی تھا علمی چند اور اُس لڑکی میں بالآخر صرف دو فقروں کا تبادلہ ہوا اور محبّت ٹوٹ گئی۔

"ڈیر شوبھا! کچھ دنوں سے تمھارا رویّہ محبوبانہ نہیں رہا۔"

"ڈیر علمی! محبوبیت ہم دونوں میں شاید کبھی بھی نہیں۔"

اور برخوردار علمی چند دوسری مرتبہ اس لیے فیل ہو گئے تھے، کیوں کہ اس بار بہت سے اور بھی لڑکے فیل ہو گئے تھے۔ مگر کُنبہ نے اُس کے دوسری بار فیل ہونے کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ بلکہ صرف اتنا کہا کہ اب علمی چند کو شادی اور ایم۔ اے کے امتحان، دونوں میں سے ایک چیز کا فوری انتخاب کر لینا

چاہیے۔

برخوردار علمی چند بظاہر کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ (گھر میں دو چراغ اور بھی ہیں) اُس کے والد صاحب جناب فاضل چند جی، جن سے برخوردار علمی چند کو شدید نفرت ہے، سوسائٹی کے معزز فرد ہیں۔ اُن کی بیوی اُن کے سامنے بچّوں کی طرح کانپتی ہے۔ کانپنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ فاضل چند جی کے پاس پچاس ہزار روپے کی جائداد ہے اور جائداد کے تلذّذ سے نہ بیٹا محروم رہنا چاہتا ہے نہ ماں۔ اس لیے دونوں فاضل چند جی کے ستم سہتے ہیں اور ڈبک کر رہتے ہیں ــــ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ علمی چند نے ایک صاحب کو اپنے والد کے ہاں بھیجا۔ تاکہ اُن سے ایک لڑکی (محبوبہ) کے رشتے کی بات چیت چلائے مگر فاضل چند جی نے ان صاحب کو جھڑک کر کہا تھا:

"علمی چند نام کا کوئی لڑکا میرے گھر میں نہیں رہتا۔ بھاگ جائیے۔۔۔۔"

چنانچہ علمی چند کے کیریکٹر کی تعمیر و تخریب میں باپ کی سخت گیری اور ماں کی مظلوم نرمی دونوں کا ہاتھ ہے۔ فاضل چند جی باپ کو گالیاں دیتے ہیں اور ماں روپے دیتی ہے۔ اگر سوسائٹی میں فاضل چند جی کی عزّت نہ ہوتی تو وہ ماں بیٹا دونوں کو خانہ بدر کر دیتے۔ مگر سوسائٹی کسی عزّت دار آدمی کو ایسا نہیں کرنے دیتی لہذا فاضل چند جی مجبور ہیں کہ وہ علمی چند کی نفرت کے باوجود اُسے ہی جائداد کا وارث بنائیں۔ فاضل چند جی اتنے بیوقوف نہیں کہ صرف بیٹے سے نفرت کی خاطر اپنی جائداد کسی دھارمک سنستھا کو دان میں دے دیں۔

لہذا جس کنیا سے علمی چند کا بیاہ ہوگا وہ ایک صاحب جائداد خاوند کی بیوی کہلائے گی۔ کیونکہ علمی چند اب اپنے انقلابی خیالات کی اُس منزل پر پہنچ چکا ہے کہ وہ اپنے باپ کی پچاس ہزار روپے کی جائداد کو ٹھکرائے گا نہیں بلکہ یوں قبول کرے گا جیسے رام بن باس کے وقت بھرت نے ایودھیا کی گدّی قبول کر لی تھی۔

اس جائداد کے علاوہ، اگر کنیا چاہے تو گھر سے جہیز لا کر اس میں اضافہ بھی

کرسکتی ہے۔ اگرچہ علمی چند جہیز کا قائل نہیں ہے۔ لیکن اگر کنیا کی شکل وصورت اچھی نہ ہو تو وہ جہیز لانے میں بھی بُرائی نہیں سمجھتا۔ البتہ اُس کے والد فاضل چند جی کا خیال ہے کہ جہیز کا تعلق حُسن سے نہیں، عزّت سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حسین بہو کو بھی جہیز لانا چاہیے۔ کیوں کہ بہو کے ہونٹ چاہے کتنے ہی گلابی کیوں نہ ہوں اگر جہیز نہیں لائے گی تو ان ہونٹوں پر کوئی بوسہ محبّت ثبت نہیں ہو سکے گا۔

بہر کیف، ہمیں ایک ایسی کنّیا کی ضرورت ہے جو فاضل چند جی اور علمی چند دونوں کے خیالات کا نچوڑ ہو۔ اور اگر کوئی ایسی کنّیا مادرِ گیتی نے پیدا نہیں کی تو کوئی ایسی کنّیا بھی قبول کر لی جائے گی جو علمی چند کی طرح یا دِ محبوب میں ابھی تک کنواری بیٹھی ہو۔

برخوردار علمی چند کا معیارِ حُسن کیا ہے؟ اس کے متعلق خود علمی چند اپنے آپ سے اختلاف رائے رکھتا ہے۔ مثلاً وہ بڑی بڑی غلافی آنکھوں کو پسند کرتا ہے۔ لیکن غلافی آنکھوں والی لڑکی کی کمر موٹی نہیں ہونی چاہیے کیوں کہ پتلی کمر پر علمی چند کو کئی شعر بہت زیادہ پسند ہیں، لیکن فطرت کسی کی شادی کے حساب سے تو کمر نہیں بناتی۔ فطرت تو ڈکٹیٹر ہے۔ سوشل ریفارمر نہیں ہے کہ غلافی آنکھوں اور کمر میں ترمیم و تنسیخ کر کے سماجی بُرائیاں دور کرتی رہے۔ لہٰذا علمی چند فطرت اور موٹی کمر دونوں سے نالاں ہے۔

دوسری طرف علمی چند چاہتا ہے کہ لڑکی شرمیلی ہو اور جب بات کرے تو اس کے خوب صورت ہونٹ فرطِ حیا سے تھرتھرانے لگیں لیکن فرطِ حیا والے کئی ہونٹ علمی چند نے دیکھے ہیں کہ فلسفہ اور دینیات پر بحث نہیں کر سکتے۔ لڑکی ایک فقرہ بولتی ہے تو ہزار بار ساڑھی کا پلّو چباتی ہے۔ ایک بار علمی چند نے اپنی ایک محبوبہ سے کہا تھا: "نیلی! فلسفی سپائی نوزا کی اخلاقیات سے مجھے بہت چڑ ہے۔ اس شخص کی بغاوت میں سے ایک نیچے کی بُو آتی ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے؟"

اور نیلم نے فرطِ حیا سے ہونٹ تھرتھرا کر کہا تھا: "مجھے خود نیچے پسند نہیں

ہیں۔ شادی کا مطلب بچے بالکل نہیں ڈیر!"

مگر علمی چند ابھی تک ہندوستان کے تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا۔ اُس کا خیال ہے کہ فطرت ایک نہ ایک دن سپائی نوزا اور تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں کو ضرور یک جا کر دے گی۔ لیکن فی الحال وہ کسی بھی ایسی لڑکی سے بیاہ کر لے گا جس کے صرف ہونٹ ہی تھرتھراتے ہوں۔ سپائی نوزا کا پارٹ وہ خود ادا کر لے گا۔

لڑکی تعلیم یافتہ ہونی چاہیے یا نہیں۔ اگر ہونی چاہیے تو کس حد تک؟ اس کے متعلق ہماری کوئی آزادانہ رائے نہیں ہے، سماج کی رائے ہی ہماری رائے ہے اور سماج کی کیا رائے ہے، اس پر سماج میں بھی اختلاف رائے ہے۔ علمی چند کہتا ہے کہ جو لڑکی غالبؔ کا شعر صحیح صحیح پڑھ سکے مگر سمجھ نہ سکے وہ مجھے پسند ہے، مگر علمی چند کی ماں کہتی ہے کہ جو بہو خاوند کی قمیص کے بٹن ٹانک سکے بڑی سوشیل کنیا ہے۔ اور اگر غالبؔ کے اشعار میں بٹن ٹانکنے کی تعلیم دی گئی ہے تو مجھے زیادہ خوشی ہو گی۔ مگر محترم فاضل چند جی کا خیال ہے کہ کنیا کو اتنی تعلیم ہرگز نہ دلائی جائے کہ کسی بھی وقت دفتر میں نوکری کر لینے کی دھمکی دینے لگے۔

بہر کیف اس بات پر سارا سماج متفق ہے کہ کنیا اپنے ور سے کم تعلیم یافتہ ہو تا کہ گھر میں امن قائم رہے۔ حد سے زیادہ تعلیم مہلک ہے۔ اور ایسے مہلک امراض پیدا کرتی ہے، جن کا بعد میں علاج ممکن نہیں۔ اس لیے کم تعلیم ہی بہتر ہے، علاج سے پرہیز بہتر ہے۔

البتہ اگر کنیا خوب صورت ہو، سڈول ہو اور پڈنگ بھی اچھا بنا سکتی ہو، تو یہ ضروری نہیں کہ وہ غالبؔ کے اشعار بھی پڑھ سکے۔ ایسی صورت میں غالبؔ والی شرط اُڑائی جا سکتی ہے، کیوں کہ غالبؔ تو دراصل پڈنگ کا نعم البدل ہے۔

اس کے علاوہ ہم کنیا کے لیے چند عام فہم شرطیں بھی عرض کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی شرطیں جن کے بغیر کوئی بیوی، بیوی نہیں کہلاتی، خاوند لگتی ہے۔ مثلاً سگھڑ ہو یعنی ٹوتھ پیسٹ اپنی مقررہ جگہ پر رکھا ہوا مل جائے، نہ کہ چوہوں کے بل سے برآمد

کرنا پڑے، وفا شعار ہو، یعنی اگر خاوند کے سر میں درد ہو تو بیوی کا معدہ خراب ہو جائے، پڑوسنوں سے ڈپلومیٹک تعلقات رکھے کیوں کہ اُن سے کئی بار آٹا اور کوئلہ عاریتاً لینا پڑتا ہے، کفایت شعار ہو، مگر خاوند کے اخراجات پر اعتراض نہ کرے، کیوں کہ خاوند لوگ بڑے ذکی الحس ہوتے ہیں، اور شدّتِ جذبات میں گھر آنا ہی چھوڑ دیتے ہیں اور برخوردار علمی چند تو اتنا حساس ہے، کہ شاید ترکِ وطن ہی کر جائے۔

کھانا نہایت نفیس پکا سکتی ہو۔ اگرچہ گھر میں عام طور پر دال بھاجی ہی پکّے گی مغل شہنشاہوں کے باورچی دال میں بھی کمال کر دکھلاتے تھے، کپڑے دھو سکتی ہو، کبھی کبھی گنگنا بھی سکتی ہو، سہیلیوں میں بیٹھ کر علمی چند کی مقبولیت کی ہوا باندھ سکتی ہو، فلم دیکھ کر علمی چند سے رومانس کر سکے، جیسے سنگترے کی پھانکیں چھیل کر منھ میں دینا اور اُس کے سر کے سفید بال نہایت پیار سے نکالنا اور محبوبانہ عشوہ سے کہنا، "جاؤ بھی، ہمیں یہ بال اچھے نہیں لگتے"۔

اشتہار ختم کرنے سے پہلے ہم ایک آخری استدعا کرنا چاہتے ہیں کہ متذکرہ بالا تمام تشریحات اور شرائط صرف علمی چند کے پس منظر کے طور پر دی گئی ہیں۔ اس لیے کنّیا کے والدین انھیں نظر انداز بھی کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ یہ اشتہار خلوص نیت سے دیا گیا ہے یعنی ہم واقعی علمی چند کی کہیں نہ کہیں شادی کر دینا چاہتے ہیں کیوں کہ علمی چند کی اب یہ حالت ہو گئی ہے، جیسے کوئی آدمی دن بھر کمرے میں بیٹھے بیٹھے اُوب گیا ہو، علمی چند کے پاس جو کچھ اپنا تھا وہ اُس کا صرف پس منظر تھا اور اب اُس کے پاس اپنا کچھ نہیں رہا، جو کچھ باقی ہے سماج کا ہے۔ علمی چند کے تمام خیالات اپنے ٹرمینس پر پہنچ چکے ہیں اور اب وہ بالکل شانت ہے۔ یہ خیالات اُس کے دشمن تھے اور اب یوں لگتا ہے جیسے کوئی اپنے دشمن کو قتل کر کے اُس کی لاش پر بیٹھا سسکیاں بھرتے بھرتے سو گیا ہو۔

اس لیے موجودہ صورتِ حال میں ہمیں ایک ایسی کنیّا چاہیے جو صرف کنیّا ہو، کنیّا ہونا ہی کافی ہے۔ باقی تمام باتیں خلفشار ہیں — لڑکی جب گھر آئے گی تو بالکل اُسی طرح گھر میں ڈھل جائے گی جیسے آج تک ہندوستان کی ہر لڑکی ڈھلتی چلی آئی ہے۔ اور اگر اشتہار میں کسی کو ہماری مردانہ نخوت کی بُو آئے تو اسے صرف اشتہار کی ڈرافٹنگ کا نقص سمجھنا چاہیے اور کچھ نہیں۔

محلّہ سُدھار کمیٹی

بھائیو! بہنو! تھوڑی سی والداؤ اور بہت سے بچّو!

آپ نے یہ اچھا نہیں کیا کہ مجھے محلہ سدھار کمیٹی کی اس سالانہ میٹنگ کا مہمان خصوصی بنا دیا۔ میں مہمان خصوصی بننے سے ہمیشہ بدکتا ہوں۔ کیوں کہ یہ ایک عزّت ہے جو انسان کو غیر فطری بنا دیتی ہے اور اس سے راست گفتاری چھین لیتی ہے۔ مثلاً اب میں اتنا بھی نہیں کہہ سکتا کہ جس کرسی پر بیٹھا ہوں اس کی ایک ٹانگ ٹوٹنے کے قریب ہے اور میں پورے وقت ایک پہلو بیٹھ کر اپنے آپ کو سنبھالے رہا ہوں۔

حضرات! کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ پورا محلہ ایک کرسی ہے۔ جس کی ایک ٹانگ ہمیشہ ٹوٹنے کے قریب رہتی ہے اور ہم سب ایک پہلو بیٹھے اپنے آپ کو سنبھالتے رہتے ہیں۔ اس سنبھالنے پر ہمارا کافی وقت صَرف ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے وقت کا یہ انتہائی بھونڈا استعمال ہے لیکن ہمیں اپنے محلّے سے چونکہ بے حد محبت ہے۔ اس لیے محبت کی خاطر ہمیں یہ بھونڈا پن کرنا ہی پڑتا ہے۔ جناب والا! محبت انسان کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔ یہ تو ہماری ذہانت ہے کہ ہم نے اس بدنصیبی کو قربانی کا دل فریب

نام دے کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا ہے، ورنہ خدا نے تو ہمیں جذبۂ محبّت عطا کر کے ہمارے ساتھ کافی بڑا مذاق کیا تھا۔

میں نے ابھی ابھی آپ سب صاحبان بلکہ "صاحبات" تک کی تقریریں سنیں جو محلہ سُدھار کے عظیم مقصد سے کی گئی ہیں۔ ان تقریروں سے ہی مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ ہمارا محلّہ بگڑے ہوئے انسانوں کا ایک مجموعہ ہے۔ اس لیے ہمارا سدھار ہونا چاہیے۔ آہ! یہ کتنی شرمناک بات ہے کہ خود ہی اپنے آپ کو ذلیل انسان کہہ کر ذلیل کریں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اپنے آپ کو ذلیل تسلیم کر لینا بہادری ہے اور ہم بہادر لوگ ہیں۔ صاحبان! اگر ایسا ہے تو میں حیران ہوں کہ آپ بہادر انسانوں کا سُدھار کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ وقت کا بھونڈا استعمال نہیں ہے کہ آپ پیغمبروں کو نصیحت کریں کہ آپ کے کپڑے میلے ہیں، اُنھیں دھویا کیجیے، حالاں کہ پیغمبر اگر کپڑے نہیں دھوتا تو اس کی کوئی گہری اور فلسفیانہ وجہ ہوگی جو اسے خود اچھی طرح معلوم ہوگی۔

اس لیے جناب! میری مانیے تو اس محلّہ کا سُدھار مت کیجیے، اگر آپ کے کپڑے میلے ہیں تو صابن سے دُھو لیجیے صرف صابن کے پراپیگنڈہ کی خاطر اتنے زیادہ لوگوں کو ایک میٹنگ میں اکٹھا کرنے کی کیا ضرورت ہے! — چند دن ہوئے اس محلّہ کے ایک بزرگ آبدیدہ ہو کر کہنے لگے: "فکر صاحب! اس محلّہ میں چوہوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ مگر کوئی ان کا تدارک کرنے والا نہیں ہے۔" میرا خیال ہے کہ وہ چوہوں کی سینہ زوری پر آبدیدہ نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کی آنکھوں میں ککرُے تھے، ورنہ چوہے تو چوہے دان کے ذریعے بھی آسانی سے پکڑے جا سکتے ہیں، اگر ہم چوہے دان اور صابن کا استعمال نہیں جانتے تو جناب ہمیں خدا سے دعا کرنی چاہیے کہ ہمیں اگلے جنم میں انسان نہ بنائے بلکہ چوہے بنا دے، جو کپڑے نہیں پہنتے اور جنھیں صابن کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیا آپ نے کبھی دیکھا کہ چوہوں نے کبھی چوہا سُدھار کمیٹی بنائی ہو اور ککڑوں کی

آڑ میں آنسو بہائے ہوں۔ بھائیو اور بہنو! بُرا نہ مانیے تو میں کہوں گا کہ چوہے ہم سے زیادہ فطری زندگی گزارتے ہیں۔

آپ شاید مجھ پر شک کر رہے ہوں گے کہ میں محلّہ کا سدھار نہیں چاہتا ایسا ہی شبہ مجھ پر اس محلّہ میں بھی کیا گیا تھا جہاں میں دو سال پہلے رہتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے بھائیو! کہ دنیا کے ہر محلّہ میں رات کو بے تحاشا کتے بھونکتے ہیں جس سے اہلِ محلّہ پریشان رہتے ہیں۔ ہر محلّہ میں ایک جھگڑالو عورت رہتی ہے جو خللِ امن کا باعث بنی رہتی ہے۔ ہر محلّہ میں دو چار آوارہ گرد نوجوان لڑکے پیدا ہو جاتے ہیں جن سے محلّہ کا اخلاق تلوار کی دھار پر رہتا ہے اور ہر محلّہ میں پانچ دس ریٹائرڈ بوڑھے بھی ضرور رہتے ہیں جو نصیحتوں کے چراغ اپنے سرہانے جلا کر بیٹھے رہتے ہیں۔

اور دوستو! یہ سب خداداد نعمتیں ہیں۔ ان سے ہم بچ نہیں سکتے۔ کسی بھی محلّہ کو ان نعمتوں سے محروم کر دیا جائے تو وہ محلّہ نہیں رہتا بلکہ جنت بن جاتا ہے اور معاف کیجیے، جنّت ایک انتہائی اُکتا دینے والی چیز ہے، جنت شوکیس میں ایستادہ "پلاسٹک" کی ایک چیز ہے۔ جس کے لب اگرچہ لعلیں ہیں مگر ان پر کسی کا بوسہ ثبت نہیں ہوا، کیوں کہ اس بوسے میں نہ حلاوت ہوتی ہے نہ حرارت۔ سچ بتائیے کیا آپ پلاسٹک کی اِس حسینہ کو کوئی محبت نامہ بھیج سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر آپ اس جہنم کے خلاف کیوں شور مچاتے ہیں۔ میں تو جب محلّہ کی کسی جھگڑالو عورت یا آوارہ گرد لڑکوں کو دیکھتا ہوں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے جنّت کے ساتھ جہنّم بھی پیدا کر دیا اور ہمارے محلّہ کو پلاسٹک کی حسینہ بننے سے بچا لیا۔ جناب والا! خدا پر اعتبار کیجیے وہ ہم سے زیادہ ذہین اور دوراندیش ہے۔ جس نے ہمیں زندگی کی حلاوت اور لذّت بخشنے کے لیے انگور ہی عطا نہیں کیے۔ بلکہ ریٹائرڈ بوڑھے بھی عطا کر دیے جو لومڑی کا رول ادا کرتے ہیں۔

آج کی میٹنگ میں ایک معزز مقررہ نے اشارتاً ذکر کیا ہے کہ ہمارے محلّہ میں

ایک شاعر رہتا ہے جو رات کو شراب میں دُھت ہو کر آتا ہے اور اُدھم مچاتا ہے۔ انھوں نے تجویز کیا کہ اُسے محلّہ سے باہر نکال دیا جائے۔ صاحبان میری رائے ہے کہ اسے محلّے سے مت نکالیے ورنہ وہ کسی دوسرے محلّہ میں چلا جائے گا اور وہاں اودھم مچائے گا اور پھر نکال دیا جائے گا۔ کیوں کہ ہر محلہ میں محلہ سُدھار کمیٹی موجود ہے۔ لہٰذا میں اس شاعر کو سمجھا دوں گا کہ وہ شاعری ترک کر دے اور کہیں لور ڈویژن کلرک بن جائے۔ شاعری ترک کرنے ہی سے وہ مے گساری ترک کرے گا کیوں کہ لور ڈویژن کلرک کے اندر، ہلدی، نمک اور ایندھن خریدنے کی تمنا بیدار ہو جاتی ہے اور شراب خریدنے کی جرأت اور استطاعت مر جاتی ہے۔ شراب ہی لطیف اور نفیس احساسات کو جگاتی ہے۔ ہلدی اور نمک لطیف احساسات کو سُلا دیتے ہیں، بلکہ مار دیتے ہیں۔ اس لیے اگر ہمیں اس شاعر کا سُدھار کرنا ہے تو اس کے اندر بسے ہوئے شاعر کو مار دینا چاہیے۔ ہمارے محلّے کو شاعری کی ضرورت نہیں، ہلدی اور نمک کی ضرورت ہے کیوں کہ ہلدی اور نمک کبھی اُدھم نہیں مچاتے حضرات! اگر آپ سب لوگ شاعر نہیں بن سکتے تو اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ آپ کے لطیف احساسات ایندھن کے ڈھیر کے نیچے دب گئے ہیں، سو گئے ہیں، مر گئے ہیں۔

ہاں میں اس شاعر کو سمجھا دوں گا کہ وہ مر جائے اس کی لاش کو کندھا دینے کے لیے پوری محلّہ سدھار کمیٹی موجود ہے۔

چند دن ہوئے محلّہ میں کیرتن کرانے کے لیے چندہ اکٹھا کیا گیا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس کیرتن سے کتنے فی صدی روحانی جذبات پیدا ہوئے۔ مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ کیرتن کے بعد پولیس آئی اور ہمارے محلّے کے لالہ کانشی رام جی کو لوہے کی بلیک کے جُرم میں گرفتار کر کے لے گئی۔ حالاں کہ لالہ جی نے کیرتن کے لیے سب سے زیادہ چندہ دیا تھا اور کیرتن کے بعد اپنے ہاتھ سے مقدس پرشاد بانٹا تھا (کیا یہ افواہ سچ ہے کہ اس نے اپنے بچّوں کو نسبتاً زیادہ پرشاد دیا تھا؟) بہرکیف مجھے پولیس کا یہ فعل پسند نہیں آیا کیوں کہ اس نے کیرتن کے روحانی اثرات پیدا ہونے کا بھی انتظار نہیں

کیا۔ دراصل لالہ کانشی رام سے زیادہ ہمیں پولیس میں روحانی جذبات پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ کیرتن کے تقدّس کو اس طرح ہتھکڑیاں پہنائی جاتی رہیں گی۔

جب میں نے جیل میں لالہ کانشی رام سے ملاقات کی اور پوچھا کہ کیرتن کا یہ غلط نتیجہ کیوں نکلا تو انھوں نے فلاسفروں کی طرح جواب دیا: "لوہے کی بلیک ایک انفرادی مسئلہ ہے۔ آپ اسے کیرتن کے جماعتی نتیجے سے کیوں ملاتے ہیں۔ دیکھ لینا مجھے کیرتن کا پھل الگ ملے گا اور میں چھوٹ جاؤں گا۔"

"کیسے؟" میں نے تشریحاً پوچھا۔

وہ مسکرائے اور بولے: "بھگوان نے میری عبادت سے متاثر ہوکر پولیس کی بدھی بھرشٹ کردی ہے اور وہ میرے ساتھ رشوت کی بات چیت چلا رہی ہے کیرتن کا پھل رائیگاں نہیں جاتا فکر صاحب! آپ کی عبادت میں سچی عقیدت اور خلوص ہونا چاہیے۔ میں پوچھتا ہوں ذرا بتائیے، پولیس کی بدھی بھرشٹ کرنے میں کس کا ہاتھ ہے؟

بھائیو، بہنو! لالہ کانشی رام کی یہ تشریح اگرچہ انوکھی اور قابلِ فہم تھی لیکن اگر وہ واقعی رہا ہوگئے تو کیا ہم میں سے کسی کی جرات ہے کہ کیرتن کے روحانی اثرات سے انکار کریں۔ البتہ صرف ایک شبہ میرے دل میں ابھی تک رینگ رہا ہے کہ اس کیرتن کے بعد محلّے کے بھگوان داس چپراسی کا سامان جب اس کے مالک شری نارائن داس نے باہر پھینک دیا تو کیرتن کا پھل بھگوان داس چپراسی کو کیوں نہیں ملا۔ حالاں کہ کیرتن میں اس نے سب سے زیادہ سرمستی اور عقیدت اور خلوص کے ساتھ ڈھول بجایا تھا اور رات بھر جاگتا اور گاتا رہا تھا۔ کیا کوئی ایسا اہتمام نہیں ہوسکتا کہ خدا ابھی اپنی بدھی بھرشٹ کرلے۔ یہ محلہ شدھار کمیٹی کا فرض ہے کہ وہ رشوت کا بندوبست کرے اور بھگوان داس چپراسی کو دوبارہ مکان دلا دے ورنہ خطرہ ہے کہ محلّہ میں کیرتن کی روایت غلط شکل اختیار کرجائے گی اور کیرتن کے روحانی اثرات میں تضاد پیدا ہوجائے گا۔ کم ازکم عبادت کی سطح پر تو چپراسی اور

آئرن مرچنٹ میں فرق مٹ جانا چاہیے ورنہ ہمارے محلّے کے لوگ کیرتن کے لیے چندہ دینے سے ہچکچانا شروع کردیں گے۔ ذرا سوچیے اگر چندہ جمع کرنے میں رکاوٹ پیدا ہوگئی تو کیا کیرتن منڈلی والے کم اجرت پر کیرتن کرنے سے انکار نہیں کردیں گے؟
محلّے کی ایک تعلیم یافتہ خاتون مسز وملا نے اپنی تقریر میں دھمکی دی ہے کہ اگر محلّے کے بچوں میں گندی گالیاں دینے کی قبیح عادت ختم نہ کی گئی تو میں محلہ چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ حضرات! مجھے یقین ہے کہ وہ محلہ نہیں چھوڑیں گی کیوں کہ ان میں لیڈرانہ صفات پائی جاتی ہیں اور وہ محلّہ کی عورتوں کی لیڈر بننا چاہتی ہیں اگر محلہ کے تمام بچے آج فیصلہ کرلیں کہ وہ گندی گالیاں نہیں دیں گے تو مسز وِملا کے لیے یہ انتہائی رنجیدہ فیصلہ ہوگا۔ کوئی لیڈر یہ نہیں چاہتا کہ گندی اور بُری چیزیں ختم ہوجائیں۔ ہماری کمزوریاں، گندگیاں اور برائیاں ہی مسز وملا کا من بھاتا کھاجا ہیں۔ اِن کا خاتمہ مسز وملا کا خاتمہ ہوگا۔ ایک تیر انداز سے اگر یہ کہا جائے کہ تم بغیر نشانہ کے تیر چلاؤ تو وہ اِسے اپنے آرٹ کی توہین سمجھے گا۔ اُسے آپ پر غصّہ آئے گا۔ اور ممکن ہے، غصہ میں محلّہ چھوڑ کر چلا جائے۔ اگر مسز وملا ابھی تک محلہ چھوڑ کر نہیں گئیں تو صرف اس لیے کیوں کہ یہاں کے بچّے برابر گندی گالیاں دیے جا رہے ہیں اور مسز وملا اُن کی ماؤں کو برابر پھوہڑ، بدتمیز اور بدنصیب کہے جا رہی ہیں۔ جناب عالی! ایک تعلیم یافتہ عورت کے ذریعے غیر تعلیم یافتہ عورتوں میں احساس کمتری جاگ اٹھا ہے اور جب لوگوں میں احساس کمتری پیدا ہو جائے تو وہاں ایک نہ ایک لیڈر ضرور پیدا ہوتا ہے جو احساس کمتری کی ستار پر اپنا نغمہ الاپتا ہے۔

اس لیے حضرات! مسز وملا کی دھمکی کو بھی ایک قسم کا نغمہ سمجھیے خدا نہ کرے کہ ہمارے محلّے کی عورتیں پھوہڑ اور بدتمیز نہ رہیں اور یہ نغمہ بند ہو جائے جسے سُن سُن کر ہمارے محلّے کی عورتیں مست ہو رہی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ گندی گالی تہذیب کے زوال کی علامت ہے اور مسز وملا نہیں چاہتیں کہ اُن کے اپنے بچّے بھی گندی گالیاں

سیکھ جائیں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسز وملا یہ بھی نہیں چاہتی تھیں کہ ایسے قیمتی محلے کو جہاں بد تہذیبی زوروں پر ہے چھوڑ کر چلی جائیں۔ دراصل مسز وملا اس محلہ کی عورتوں اور بچّوں میں تہذیب کی داغ بیل ڈالنا چاہتی ہیں۔ چاہے اس کے لیے انھیں کتنی قربانی دینی پڑے۔ چاہے اس کے اپنے بچے گندی گالیاں سیکھ جائیں۔ جناب! لیڈروں میں قربانی کا زبردست جذبہ پایا جاتا ہے۔ اس لیے مسز وملا کو قربانی کا موقع دیجیے ورنہ ان کی افسردگی اور بڑھ جائے گی اور آنکھوں کے سیاہ حلقے اور گہرے ہو جائیں گے جو محلّہ کی بدتمیزی پر کڑھنے سے پیدا ہو گئے ہیں۔

بھائیو اور بہنو! اپنی تقریر ختم کرنے سے پہلے میں آخری گزارش کروں گا کہ اس محلے کے سدھار کے غم کو اتنا گہرا مت بنائیے۔ بلاشبہ آپ اس میں چند سطحی تبدیلیاں لے آئیے، مگر کوئی بنیادی تبدیلی لانے کی مصنوعی کوشش نہ کیجیے۔ بے شک آپ چوہوں کو محلہ بدر کرنے کے لیے بلیاں پالنے کا پلان بنائیے ان کے ساتھ کچھ بلّے بھی لے آئیے گا تاکہ بلیوں کی زندگی "ڈل" نہ ہو جائے محلے کی صفائی ستھرائی کے لیے کوئی مشترکہ فنڈ قائم کر لیجیے (فنڈ اتنا کم نہ ہو کہ اس میں غبن کی گنجائش نہ رہے) چوروں کو ڈرانے کے لیے ایک باتنخواہ پہرے دار بھی رکھیے (پہرے دار سو فی صدی جفاکش اور احمق ہو، تاکہ چوروں سے نہ مل جائے) محلّہ میں کسی کا انتقال ہو جائے، کسی کا جنم ہو جائے، کسی کی شادی ہو جائے یا کسی کا لڑکا لڑکی بھاگ جائے تو بے شک سب مل کر آنسو بہائیے یا قہقہے لگائیے (اور یہ سب کچھ اس لیے کیجیے کہ آپ سب کے ساتھ بھی یہ سانحہ ہو سکتا ہے۔)

غرض یہ سب کچھ کیجیے، جس کا آپ کے دل سے کوئی گہرا تعلق نہ ہو جناب! میں یہ تھوڑی سی کڑوی بات اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ ہم اس سے زائد کچھ کر بھی نہیں سکتے ورنہ ہم میں سے کوئی فرد محلّہ سدھار کمیٹی کو یہ اجازت دے گا کہ اس کے دل اور روح کی سلطنت پر حملہ کر دے؟ کیا آپ محلّہ سدھار کمیٹی کو یہ اجازت

دیں گے کہ وہ آپ کو انڈا کھانے کا حکم دے جب کہ آپ ٹماٹر کاٹ کر کھا رہے ہوں ؟ ایک بار میں نے محلّے کے ایک شخص سے کہا: "جناب! آپ کے چہرے پر جو داڑھی ہے وہ انتہائی بدنما لگتی ہے آپ روزانہ شیو کیا کیجیے"۔ تو وہ مجھ سے اتنا ناراض ہوا کہ میں اب اس سے ڈر کے مارے وہ دس روپے بھی نہیں مانگتا جو اس نے مجھ سے قرض لیے تھے ۔ اسی طرح ایک بار محلّہ کے ایک معزّز آدمی نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ آپ پان مت کھایا کیجیے۔ اس سے آپ کے دانت جھڑ جائیں گے۔ میں حیران ہوا کہ میرے دانت جھڑنے سے اس آدمی کو کیا دل چسپی ہے ؟ کیا صرف اس لیے میں اس کی بات مان لوں کہ میں کبھی کبھار اس سے اخبار پڑھنے کے لیے مانگ لاتا ہوں ؟

اس لیے جناب ! ہم ایک محلّے میں رہنے کے باوجود الگ الگ انسان ہیں۔ محلہ سدھار کمیٹی اگر ہم الگ الگ انسانوں کو ایک لاٹھی سے ہانکنا چاہتی ہے تو یہ اس کی سنگ دلی ہے بلکہ ایک غیر فطری حرکت ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ نے مجھے خصوصی مہمان کی عزّت دے کر، غیر فطری باتیں کہنے پر پابند کر دیا۔ آپ کے ماتھے پر اس وقت جو شکن پڑ رہے ہیں وہ ظاہر کرتے ہیں کہ میں نے اس پابندی کو کیوں توڑ دیا ہے اور اس کرسی کے ٹوٹنے والے پائے کا ذکر کیوں کر دیا جو شاید لالہ کانشی رام کے گھر سے لائی گئی ہے اور جو آج کل بلیک کے جرم میں جیل میں بند ہیں۔

وارنٹ گرفتاری

ایک دن میں رات کو گھر لوٹا تو راستہ میں ایک بیل گاڑی سے ٹکرا گیا اور عینک کا فریم ٹوٹ گیا۔ وجہ یہ تھی کہ اس شام کو ایک ادبی اجتماع میں وزیر تہذیبی امور نے مجھ سے کہا تھا کہ فکر صاحب! آپ سلطنت ادب کے کوہ نور ہیرے ہیں۔

اور کوہ نور ہیرا فرط مسرت میں جب عینک کا فریم تڑا کر لوٹا تو بیوی نے دیکھتے ہی کہا:

"آج آپ کے وارنٹ گرفتاری آئے تھے!"

منجھلے بچے نے مارے خوف کے چیختے ہوئے کہا:

"ڈیڈی کیا آپ اب جیل چلے جائیں گے؟"

سب سے چھوٹے بچے نے خوشی سے اعلان کیا:

"ڈیڈی! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا!"

پڑوسی رگھو رام میری آواز کی بو سونگھ کر آ گیا اور بولا:

"فکر صاحب! شاید بیلف کل بھی آئے گا۔ اس لیے گرفتاری سے بچنا چاہیے!"

پڑوسی مادھو رام جس کی پڑوسی رگھو رام سے خاندانی دشمنی تھی۔ اس نے رگھو رام کی آواز کی بو سونگھی تو آکر بولا:

"فکر صاحب شریف آدمی ہیں۔ بچنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انھیں خود بخود کچہری میں حاضری ہو جانا چاہیے۔"

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یہ کاہے کے وارنٹ گرفتاری تھے ؟ کس جرم میں ؟ میں نے اپنے گزشتہ چالیس سالہ جرائم پر نگاہ ڈالی تو صرف ایک جُرم دکھائی دیا۔ جب کہ پندرہ برس کی عمر میں لائبریری سے میں نے ایک کتاب چرائی تھی (مگر آج کل تو میں اس لائبریری کی مشاورتی کمیٹی کا ممبر تھا) میں نے بیوی سے پوچھا:

"تم نے وارنٹ کی عبارت پڑھی تھی ؟"

"ہاں، عدم ادائیگی قرضہ کے وارنٹ تھے۔"

بیوی نے زندگی میں پہلی بار سچی بات کہی تھی۔ حالاں کہ اس سے پہلے وہ سینکڑوں بار کہہ چکی تھی کہ میں آپ سے سچی محبت کرتی ہوں۔ مگر مجھے اعتبار نہیں آتا تھا، کیوں کہ سچی محبت وہ صرف اپنی ماں سے کرتی تھی۔ میں نے سرکار سے سچ مچ ایک بار قرض لیا تھا اور واپس اس لیے نہیں کیا تھا، کیوں کہ میرا خیال تھا کہ سرکار کے پاس مجھ سے زیادہ پیسہ ہے۔

لیکن سرکار نے سماجی انصاف کی خاطر میرے وارنٹ نکال دیے۔ وارنٹ کا تصوّر نہایت گھناونا ہوتا ہے۔ گندی گالی وارنٹ سے کم توہین انگیز ہوتی ہے سب سے زیادہ غصّہ مجھے پڑوسی رگھو رام پر آیا جسے یہ معلوم ہو گیا کہ سرکار مجھے ہتھکڑی لگانے آئی ہے میں سالے رگھو رام کو اب اپنا ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنے کے لیے کبھی نہیں دوں گا۔

دوسرا غصہ سرکار پر آیا۔ اس نے میرے وارنٹ کیوں نکال دیے ؟ کسی اور کے نکال دیتی۔ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ سرکار کے وزیر تہذیبی امور نے مجھے کوہ نور ہیرا کہا ہے۔ ایک طرف کوہ نور، دوسری طرف وارنٹ ؟ ایک ہی آدمی کے بارے میں سرکار کی یہ ڈبل پالیسی کیوں ہے ؟

اور پھر سرکار نے مجھے قرضہ ہی کیوں دیا تھا (ضمیر نے کہا تم نے خود مانگا

تھا) کیا سرکار کو معلوم نہیں تھا کہ میں لوٹا نہیں سکوں گا اور پھر میں نے اکیلا تھوڑے لیا تھا۔ ہزاروں مصیبت زدگان نے لیا تھا۔ سرکار کا فرض تھا کہ یہ قرضے معاف کر دیتی۔ تاریخ میں تو یہ اکثر ہوتا ہے کہ سلطنتوں کے اربوں روپے ڈوب جاتے بلکہ خود سلطنتیں ڈوب جاتی ہیں۔

رات بھر ڈر اور غصہ میں نیند نہ آئی اور میں سرکار، قانون، بیلف، حتیٰ کہ گھر کے چوہوں تک کو کوستا رہا جو ہماری چینی کی پلیٹیں توڑ جاتے ہیں۔ صبح کے قریب آنکھ لگی تو خواب میں والد صاحب نے درشن دیے اور کہا: "قرضہ چکا دو بیٹا! کیوں باپ کا نام ڈبو رہے ہو۔

جب آنکھ کھلی تو سب سے پہلا خیال یہ آیا کہ بیوی بچوں کو لے کر ہر دوار چلا جاؤں اور گھر کے دروازے پر یہ چٹ چسپاں کر جاؤں۔

"فکر تونسوی اپنے گناہوں کے پشچاتاپ کے لیے تیرتھ یاترا پر گیا ہُوا ہے"

لیکن ــــ (۱) اگر سرکار نے فراری ملزم قرار دیا؟
(۲) اگر آج کمبخت بیلف پھر آ گیا؟
(۳) اگر کچہری میں خود بخود حاضر ہونے پر کلکٹر نے جیل میں ڈال دیا؟

والد صاحب کی اس تجویز پر سخت افسوس ہوا کہ قرضہ چکا دو۔ آہ۔ آہ! گہنے گروی رکھ دوں؟ مگر نہیں۔ دنیا کی نوے فی صد بیویاں گہنوں کو خاوند سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔ بلکہ عین ممکن ہے، بیوی اسی پوائنٹ پر طلاق کی دھمکی دے ڈالے۔ کیا کسی وکیل سے مشورہ کروں؟ مگر والد صاحب نے ایک بار نصیحت کی تھی کہ بیٹا! آدھے حکیم اور پورے وکیل کے پاس نہ جانا۔ دونوں روگ بڑھا دیں گے۔

صرف ایک طریقہ باقی تھا کہ بغیر ناشتہ کیے گھر سے چلا جاؤں اور بیوی سے کہہ جاؤں کہ بیلف آئے تو اسے اطلاع دے دینا کہ ملزم ہندوستان چھوڑ کر

ٹانگا نیکا چلا گیا ہے اور اس جنم میں نہیں لوٹے گا۔

چنانچہ جلدی جلدی کپڑے بدلے، بیوی کو وصیت کی اور گھر سے باہر نکل گیا۔ راستہ میں جو آدمی بھی خاکی وردی پہنے گزرتا میری طرف گھورتا اور میں آنکھیں بند کر کے اسے جُل دیتا اور آگے بڑھ جاتا اور اُس دن سڑک پر نہ جانے کیوں؟ ہزاروں بیلف وارنٹ لیے گھوم رہے تھے۔ لیکن میں ان کے ہاتھ نہیں آیا۔ دن بھر کئی دوستوں، دفتروں اور آشناؤں کے ہاں گیا (یہ سب میرے ٹانگا نیکا تھے) اور آخر شام کو ایک ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا اور دوستوں سے گپ شپ لڑانے لگا۔

اچانک ریسٹورنٹ میں بیٹھے بیٹھے کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پُراسرار جنٹلمین ہماری میز کی طرف بڑھ رہا ہے، قریب آتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا:

"کیا آپ کا نام فکر تونسوی ہے؟"

میں نے بہادرانہ لہجہ میں کہا (کبھی کبھی ڈر کی شدت میں انسان بہادر بھی بن جاتا ہے):

"نہیں صاحب! میرا نام رام گوپال ہے، البتہ فکر تونسوی کو جانتا ضرور ہوں۔"

اب مجھے یقین آگیا کہ یہ وہی کم بخت بیلف ہے جو بھیس بدل کر آگیا ہے، سوچا اسے غلط ایڈریس بتا دوں، لیکن جلدی میں کوئی غلط ایڈریس بھی نہیں سوجھا اور کہہ دیا "ٹانگا نیکا چلے گئے ہیں۔"

شخص مذکور مایوس ہو کر چلا گیا۔ بعد میں ایک دوست نے بتایا کہ یہ ایر انڈیا کارپوریشن میں ملازم تھا اور تمہارا مداح تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ ایک مداح خواہ مخواہ میرے ہاتھوں بیلف بن گیا۔

شام کو چار بجے کے قریب گھر لوٹا۔ اپنے پلان کی کامیابی پر نازاں، اپنی

اپنی بزدلی پر شرمندہ، لیکن وارنٹ کے تصوّر سے بدستور ہراساں۔
جوں ہی گھر کی کنڈی کھٹکھٹائی، بیوی نے اندر سے آواز دی:
"کون ہے؟"
میں نے مذاق میں کہا:
"بیلف۔"
اندر ہی سے کرخت لہجہ میں جواب آیا:
"مُوا پھر آگیا ــ اجی بیلف صاحب! تم سے تین بار کہہ چکی ہوں فکر صاحب ٹانگا نیکا گئے ہوئے ہیں۔"
میں نے کہا:
"ڈارلنگ! میں ٹانگانیکا سے واپس آگیا ہوں۔"
بیوی نے ڈارلنگ کے لفظ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا:
"ہاں ہاں ٹانگانیکا جو براعظم افریقہ میں ہے۔"
اس مرتبہ بیوی کی ہنرمندی پر بے حد پیار آگیا۔ میں پہلے سمجھا کرتا تھا فضول سی بیوی ہے۔ صرف بچے پیدا کرنا جانتی ہے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ تو جغرافیہ بھی جانتی ہے۔
میں نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ کیوں کہ ڈپلومیٹک بیوی سے مجھے ایک اور خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں میں دروازے پر ہی کھڑا نہ رہ جاؤں اور وہ دروازہ ہی نہ کھولے اور حد سے زائد ہنرمندی میں مجھے پہچاننے سے ہی انکار کر دے۔ چنانچہ میں پچھلی دیوار پھاند کر اندر آنگن میں داخل ہو گیا۔
"یہ کیا حرکت ہے؟"
عرض کیا: "جب فکر تونسوی اور بیلف میں فرق مٹ جاتا ہے تو دیوار پھاند کر اندر آنا پڑتا ہے۔ تم نے دروازہ کیوں نہیں کھولا؟"
آپ نے کیوں کہا تھا کہ میں بیلف ہوں۔ وہ کم بخت آج تین مرتبہ آیا تھا۔

مجھے خطرہ ہے کہ کہیں پھر نہ آجائے۔"

"ہنھ پاگل ہوئی ہے کیا؟ رولز کے مطابق اب میرے وارنٹ ٹانگا نیکا ہی جائیں گے۔"

بیوی بے اختیار ہنس پڑی، بچے بھی ہنس پڑے۔ میں خود بھی کسی حد تک ہنس پڑا۔ لیکن دل کی نچلی تہوں میں کوئی بیٹھا کہہ رہا ہے۔

"اور اگر بیلف آگیا تو۔۔۔"

اور دوسرے دن بیلف واقعی آگیا۔

میں برآمدے میں کرسی ڈالے اخبار پڑھ رہا تھا کہ اچانک کیا دیکھتا ہوں، بیلف میری کرسی کے عین پیچھے کھڑا تھا۔ دماغ نے کہا۔" اگر یہ بیلف ہے بھی تو بھی سمجھو کہ بیلف نہیں ہے۔ تم اخبار پڑھتے رہو۔"

بیلف نے کہا" جناب!۔۔۔"

میں نے اخلاقاً کہا:

"کون ہو، کیا چاہتے ہو؟"

"جناب! کیا فکر تونسوی صاحب آپ کا اسم گرامی ہے؟"

"میرا خیال ہے، پہلے آپ بتایئے کہ آپ کا اسم گرامی کیا ہے؟"

"میں سرکاری بیلف ہوں۔"

"تو پھر میں فکر تونسوی نہیں ہوں۔"

بیلف مسکرا دیا (کتنی خوفناک مسکراہٹ تھی ظالم کی) چند سیکنڈ تک مجھے گھورتا رہا اور جب تک وہ گھورتا رہا میں دل ہی دل میں گائتری منتر کا جاپ کرتا رہا۔ آخر کار وہ بولا:

"جناب! آپ مذاق کر رہے، کیوں کہ آپ مزاح نگار ہیں نا؟ مگر عرض یہ ہے کہ میں نے آپ کا فوٹو ایک رسالہ میں دیکھا تھا۔ جس کے نیچے فکر تونسوی لکھا تھا۔"

"وہ پرنٹنگ کی غلطی ہوگی۔"

"ایک بار ایک مشاعرہ میں آپ کو نظم پڑھتے بھی دیکھا تھا۔"

"وہ مشاعرہ والوں کی غلطی ہوگی۔"

"اور آپ کے پڑوسی رگھو رام نے بھی مجھے ابھی ابھی بتایا ہے کہ وہ سامنے کرسی پر فکر تونسوی صاحب ہی بیٹھے ہیں۔"

اب میں نے گائیتری منتر پڑھنا بند کر دیا۔ اس زمانے میں گائیتری منتر میں بھی جان نہیں رہی۔ چنانچہ گائیتری منتر کی بجائے میں نے خاندانی شرافت کا سہارا لیا اور کانپتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ کہا۔

"اچھا چلو، مذاق ختم۔ بتاؤ کیا چاہتے ہو؟"

"آپ کو تحصیلدار صاحب نے عدالت میں بُلایا ہے۔ آپ کے وارنٹ گرفتاری ہیں۔"

آہ! یہی وہ غلیظ فقرہ تھا، جسے میں سننا نہیں چاہتا تھا۔ اخبار ایک طرف رکھ کر میں نے وارنٹ گرفتاری اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اسے خواہ مخواہ پڑھنا شروع کیا۔ وارنٹ پر وہی روایتی توہین انگیز عبارت تھی جو کچھ اس طرح تھی:

"....... ہر گاہ کہ مسمی فکر تونسوی ولد .... ذات .... پیشہ .... سکنہ .... دیدہ و دانستہ عدالت میں حاضر ہونے سے گریز کر رہا ہے، لہٰذا بسلسلۂ عدم ادائیگی قرضہ مجریہ سرکار عالیہ ۱۹۵۰ء مسمی مذکور کے وارنٹ گرفتاری جاری کیے جاتے ہیں کہ ملزم کو گرفتار کر کے بہ عدالت تحصیلدار صاحب مورخہ .... تک پیش کیا جائے ....

دستخط

مہر عدالت ...."

میں نے محسوس کیا کہ میرے بیوی بچّے کھڑکیوں میں کھڑے مجھے جھانک رہے ہیں۔ اِدھر اُدھر کی کھڑکیوں سے دو چار پڑوسیوں کے منحوس چہرے بھی جھانکتے دکھائی دیے۔

پہلے میں نے سوچا کہ بیلف سے کہوں، وارنٹ کی عبارت ٹھیک کرا کر لاؤ۔ کیوں کہ ادبی اعتبار سے اس میں کئی سقم ہیں۔ لیکن بیلف نے مجھ سے پہلے کہہ دیا:

"تو چلیے جناب"۔

میں نے کہا۔ "ٹھہر چلتا ہوں، تھوڑا سا سوچ لوں"۔

رگھو رام پڑوسی ہماری باتوں کا لطف اُٹھانے کے لیے ہمارے پاس آگیا۔ "کمینہ!"۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ لیکن وہ اُلٹے ہمدردی جتانے کے لہجہ میں بولا:

"کیا بات ہے فکر صاحب؟"

میں نے کہا۔ "کچھ نہیں، ان صاحب کی ایک بھینس گم ہو گئی ہے۔ پوچھ رہے ہیں ہمارے گھر تو نہیں آئی؟"۔

رگھو رام بولا، "معمولی بات ہے، مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ بھائی صاحب ذرا ادھر میری بات تو سنیے"۔

وہ بھائی صاحب کو ایک طرف کونہ میں لے گیا اور کھسر پھسر کرنے لگا۔ شاید اسے بھڑکا رہا تھا کہ تم فکر تونسوی کو ضرور گرفتار کر کے لے جاؤ ورنہ تمھاری رپورٹ کر دوں۔ . . . مگر بیلف مسلسل انکار میں سر ہلا رہا تھا۔ اتنے میں رگھو رام میرے پاس آیا اور سرگوشی میں بولا:

"اجی دو روپے دے دو سالے کو، ٹل جائے گا"۔

میں اصولی طور پر رشوت کے خلاف ہوں۔ لیکن سوچا کہ یہ کارآمد اصول کسی اور بہتر وقت کے لیے استعمال کروں گا۔ لہذا جھٹ دو روپے نکال کر رگھو رام کی ہتھیلی میں تھما دیے۔ رگھو رام نے بیلف کے صدیوں کے افلاس زدہ چہرے کی طرف دیکھ کر کہا:

"یہ رکھ لیجیے"۔

بیلف نے حقارت سے زمین پر تھوک کر کہا:

"اجی! کیا آپ مجھے رشوت خور سمجھتے ہیں؟"

میں نے جو تیسرا روپیہ دینے کے لیے جیب سے نکالا تھا ڈر کے مارے واپس جیب میں ڈال لیا (سچے اور ایماندار آدمی سے کبھی کبھی کتنا ڈر آتا ہے!)۔

رگھو رام نے بھی تکنیک بدل لی، بولا:

"بیلف! کیا تم جانتے ہو فکر صاحب بہت بڑے ادیب ہیں؟"

میں نے بغیر سوچے سمجھے کہا:

"میں رگھو رام سے اتفاق کرتا ہوں۔"

بیلف نے جواب دیا، "ہاں، میں ان کا مداح ہوں، لیکن سرکار کا نوکر بھی ہوں اور یہ میری نوکری کا سوال ہے۔"

بیلف کی مدلل ضد نے ہمیں بے بس کر دیا۔ اب مجھے بیلف پر نہیں سرکار پر غصّہ آ رہا تھا یہ کیسی سرکار ہے جس کا بیلف اور کلچرل منسٹر دونوں میرے مدّاح ہیں مگر مجھے گرفتاری سے نہیں بچا سکتے۔ ایسی سرکار کا کیا فائدہ؟ ایسی سرکار کو بدل دینا چاہیے ایسی سرکار مردہ باد!— انقلاب زندہ باد!!

تھوڑی دیر ایک خوف ناک خاموشی طاری رہی۔

اور پھر میں بغیر سوچے ایک طرف چلنے لگا۔

بیلف بھی میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

میں نے رومال سے ناک صاف کیا۔

بیلف نے بھی اپنا ناک صاف کیا۔

بیلف میرا تعاقب کیوں کر رہا ہے۔ بیلف مجھے چور سمجھتا ہے۔ یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ مجھے بہادروں کی طرح گرفتار ہو جانا چاہیے۔ میرے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ بیلف نے کہا،

"جناب! چلیے، اب کوئی مزید بہانہ مت سوچیے۔"

"بے ــ بہانہ کیسا؟" میں اکڑ گیا ــ "میں تمھارے وارنٹ سارنٹ سے نہیں ڈرتا۔ اور ابھی کپڑے بدل کر تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔"

"مگر اب آپ کپڑے بھی نہیں بدل سکتے۔ آپ جانتے ہیں کہ مجھے ہتھکڑی لگانے کے اختیارات بھی ہیں۔"

جی چاہا، بیلف کے منہ پر طمانچہ جڑ دوں لیکن مداح سمجھ کر رک گیا۔ توہین، ہتھکڑی، جیل، تحصیلدار سبھی بھوتوں کی طرح میرے ارد گرد ناچنے لگے اور جیسے کوئی گھناونا خواب دیکھتے وقت آدمی بول نہیں سکتا، میری زبان بند ہوگئی۔ میں نے محسوس کیا کہ کھڑکی میں جھانکتی ہوئی میری بیوی نے ایک دردناک چیخ ماری ہے۔ شاید زمین پر گر کر بیہوش بھی ہوگئی ہو۔ (کبھی کبھی ان بیویوں کو خاوندوں پر بے ساختہ پیار آجاتا ہے)۔

آخری نوٹ: اس کے بعد کی کہانی نہایت معمولی ہے کہ مصنف عدالت میں چلا گیا اور فوراً ہی رہا کر دیا گیا۔ لیکن مصنف اس ڈسپیچ کلرک کا ہمیشہ ممنون رہا جس کی ذرا سی غلطی سے اس کے وارنٹ جاری ہو گئے۔ کیوں کہ اگر کلرک غلطی نہ کرتا تو مصنف اتنی خوب صورت کہانی نہیں لکھ سکتا تھا۔

اور مجھے ایوارڈ ملا

ایک دن سردار ملکھا سنگھ جی نے آکر مجھ سے کہا: "فکر صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے؟"

میں نے عرض کیا، "حضور میری معلومات تو آپ سے بھی ناقص ہے۔"

اسے میری بات پر شرمندہ ہونا چاہیے تھا، مگر آہ نہیں ہوا۔ کیوں کہ بدقسمتی سے وہ میرے خلوص نیت پر یقین رکھتا تھا اور اعتقاد نے ہمیشہ خودی کی کئی عمارتیں ڈھائی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نے ہمیں گمراہ کر دیا تھا۔ ورنہ عمارت ڈھے جانے پر خدا نے بندے سے کبھی نہیں پوچھا کہ بتا "تیری رضا کیا ہے۔ کیا کوئی دوسری عمارت تعمیر کرنی ہے؟"

قارئین کرام! اوپر کی تین چار سطریں غیر ضروری ہیں کیوں کہ غیر ضروری موضوع پر غیر ضروری فقرے لکھنا میرے قلم کی پرانی خصلت بن چکی ہے ورنہ موضوع کی اصل بنیاد تو سردار ملکھا سنگھ تھا۔ وہ دو چیزوں کا مدّاح تھا۔ اردو زبان اور ادب کا۔ اور عمارتی ٹھیکے داری کا۔ وہ اردو زبان اور ادب اور عمارتی ٹھیکے داری کو ہم مشرب سمجھتا تھا۔ جیسے کئی ایک نقّاد، پائپ اور قلم کو ہم پیشہ سمجھتے ہیں۔ مگر سردار ملکھا سنگھ نقّاد نہیں تھا، بد نصیب اعلیٰ رکھتا تھا، یعنی اردو زبان کی ادبی تخلیقات کا متوالا تھا اور متوالوں کی معلومات ہمیشہ

ناقص رہتی ہیں۔ بے خطر شعلۂ نمرود میں کود پڑتی ہیں۔ لہذا وہ میرے تفریحی فقرے کو نظر انداز کر کے سنجیدگی سے بولا:

"نہیں نہیں! میرا مطلب ہے کہ آج کل اردو ادیبوں کو کئی طرح کے سرکاری اور نیم سرکاری اور غیر سرکاری ایوارڈ دیے جا رہے ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟

میں نے کہا۔ "سبب مجھے معلوم ہے۔"

"تو بتائیے۔"

"نہیں بتاتا۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ ڈرتا ہوں کہ کہیں مجھے بھی کوئی ایوارڈ نہ مل جائے۔"

"ایوارڈ مل جائے۔ تو یہ آپ کی عزّت افزائی ہے۔ آپ کو ایوارڈ ضرور ملے گا۔"

"بتائیے آپ کون سا ایوارڈ لینا چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "نوبل پرائز! میں ہر مرتبہ انتظار کرتا ہوں مگر وہ مجھے دیتے ہی نہیں۔"

نوبل پرائز سے سردار ملکھا سنگھ صرف اتنا آگاہ تھے۔ جتنا کوئی بھینس اپنے پانی ملے دودھ سے۔ لہذا اس نے طیش میں آ کر پنجابی زبان میں دو چار کراری اور فحش گالیاں سُنائیں۔ یہ گالیاں مجھے نوبل پرائز سے زیادہ جینوین لگیں۔ بولا:

"اجی، لعنت بھیجیے نوبل پرائز پر۔ میں آپ کو نوبل پرائز سے زیادہ عالی شان ایوارڈ دلوا سکتا ہوں۔ بولیے قبول فرمائیں گے؟"

سردار ملکھا سنگھ نے عمارتی ٹھیکیداری میں کم از کم پچاس لاکھ روپے کمائے ہوں گے۔ ان میں وہ چار پانچ لاکھ روپے خاص نہیں ہیں جو اس نے سرکاری افسروں کو بطور رشوت عطا کیے تھے، بطور ایوارڈ نہیں دیے تھے جب کہ اس کے مقابلے

پر اردو ادیبوں کو جو نقد رقم دی جاتی تھی وہ بقول ایک سرکاری ترجمان ایوارڈ ہی ہوتی تھی، رشوت نہیں۔

مجھے لگا، سردار ملکھا سنگھ، جذباتیت میں بھیگ چکا ہے۔ لہذا میں نے پوچھا:

"ملکھا سنگھ جی! آپ نے ادبی ایوارڈوں کا ذکر کر کے میری جوگت بلکہ درگت بنا دی ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ دراصل آپ کا نصب العین کیا ہے؟"

وہ بولا: "میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں چوں کہ اردو ادب کا عاشق ہوں۔ اس لیے میں بھی ایوارڈوں کے ذریعے اردو ادب کی خدمت کروں۔ اللہ کے فضل سے میں نے عمارتی ٹھیکیداری سے جائز اور ناجائز بلکہ ناجائز زیادہ پچاس لاکھ روپے کے قریب کمائی کی ہے تو کیوں نہ ان میں سے دس لاکھ روپیہ اپنے اردو ادیبوں پر بطور ایوارڈ نچھاور کر دوں، کیا خیال ہے آپ کا؟"

میں نے سر انکار میں ہلا دیا "ملکھا سنگھ جی! آپ ادبی ایوارڈ نہیں دے سکتے۔ عمارتی ٹھیکے دار اگر ادب کا بھی ٹھیکے دار بن جائے تو یہ ادب کی توہین ہے!"

وہ میز پر غصیلی تھاپ جما کر بولا:

"تو یہ سرکاری اور غیر سرکاری اکیڈیمیاں ایوارڈ دیے جا رہی ہیں — یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا، "یہ بھی ادب کی توہین ہے!"

یہاں توہین کا لفظ میرے مُنہ سے اس لیے نکل گیا کہ حال ہی میں ایک مشہور اردو اکیڈیمی نے ایک زلفوں والی دوشیزہ شاعرہ کو (کم از کم وہ ابھی تک اپنے آپ کو دوشیزہ کہے جا رہی تھی) ایک شعری مجموعہ پر دو ہزار روپے کا ایوارڈ دیا تھا جس کے ہر صفحے پر تین چار شعر بحر اور وزن سے خارج تھے مگر اس کتاب کا جشنِ اجرا چوں کہ ایک وزیر صاحب نے کیا تھا اس لیے کسی نقاد نے خارج از وزن اشعار پر بُرا نہیں مانا۔ میں نہیں جانتا وہ ایوارڈ، بوب زلفوں کو دیا گیا تھا یا وزیر صاحب کو؟ کسی نے یہ نہیں کہا کہ وزیر صاحب خود بحر و وزن سے

خارج تھے مگر مجبوری یہ تھی کہ بوب زلفوں میں غنائیت تھی۔

سردار ملکھا سنگھ نے کہا۔" مگر دیکھیے فکر صاحب! اردو اکیڈمیوں پر تین حرف بھیجے۔ کیوں کہ ممکن ہے کہ ان کے ایوارڈوں میں بگڑی ہوئی ادبی یا غیر ادبی سیاست شامل ہو، کیوں کہ سرکار اور بگاڑ دونوں ہم خرما و ہم ثواب بن چکے ہیں۔ لیکن میری ایوارڈ اسکیم ان سے ممتاز اور شفاف ہے اور پھر ضروری نہیں کہ سرکار ہی ادب کی اجارہ دار بن جائے۔ دوسرے بھی تو بن سکتے ہیں۔"

" مثلاً۔"

" مثلاً گزشتہ دنوں ہندو رکھشا سمتی نے اردو ادیبوں کو ایوارڈ دیے ہیں۔"

" اردو کے ہندو ادیبوں کو ہی دیے ہوں گے۔"

" تو کیا حرج ہے۔ اس سے یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ اردو ایک سیکولر زبان ہے۔"

میں نے کہا، " ہاں ہاں سیکولر ہی نہیں، وِدھوا بھی ہے۔"

سردار ملکھا سنگھ نے جوش و خروش میں میرے کندھے پر ہتھیلی یوں ٹکائی جیسے دیوار پر اینٹ جما رہا ہو۔ بولا زندہ باد فکر تونسوی آپ تو جیوتشی ہیں کیوں کہ کل ہی مجھے معلوم ہوا کہ واقعی ایک پچاس سالہ قدیم ودھوا آشرم نے اپنی گولڈن جبلی پر پچیس ہزار روپے صرف اردو ادیبوں کو ایوارڈ دینے کے لیے مخصوص کر دیے ہیں۔

پس کہ ثابت ہوا کہ ملکھا سنگھ کی معلومات مجھ سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔ چنانچہ میں نے مجبوراً سر تسلیم خم کر دیا۔ تو پھر آپ کی ایوارڈ اسکیم بجا۔ مگر میرا مشورہ ہے کہ پہلے دس لاکھ روپے کی بجائے صرف ایک لاکھ روپے کے ادبی ایوارڈ تقسیم کیے جائیں۔ اس کے لیے ایک انجمن بنا لیتے ہیں۔ " انجمن ملکھان ادب۔"

وہ اُچھل پڑا بولا:

" مگر پہلا ایوارڈ آپ کو پیش کیا جائے گا پچیس ہزار روپیہ۔"

میں نے کہا۔"آپ تو خیر مجھے ایوارڈ عنایت کریں گے ہی۔ کیوں کہ میں آپ کا اور آپ میرے دوست ہیں۔ آپ کے ادبی ایوارڈوں کا ساربان بننے کا فخر مجھے ہی عطا کیا جائے گا۔ لیکن باقی.....؟"

وہ بولا، "باقی ادیبوں کی آپ ایک فہرست مرتب کر لیجیے۔ کسی کو دو ہزار روپے، کسی کو ایک ہزار، کسی کو ساڑھے سات سو روپے۔"

میں نے کہا۔" بلکہ کسی کو ایک سو ایک روپیہ، کسی کو اکیاون، کسی کو گیارہ، کسی کو پانچ روپے پچیس پیسے، کسی کو تین روپے۔ فہرست قدرے طویل بنا لیں گے۔"

وہ کم بخت بے اختیار ہنس پڑا۔" آپ تو ایوارڈیوں بانٹ رہے ہیں جیسے معمے حل کرنے والوں میں بانٹے جاتے ہیں مگر جناب یہ ادب ہے، معمہ نہیں ہے۔"

"بجا فرمایا۔ مگر اسے ادبی معمہ سمجھ لیجیے۔"

شاعروں کی فہرست بنائی تو ان کی تعداد نکلی۔ پانچ ہزار سات سو آٹھ شاعر۔ ان میں سے وہ شاعر جو عمرِ طبعی کو کئی بار پار کر چکے تھے۔ اور خطرہ تھا ایوارڈ کا اعلان ہوتے ہی وہ اس جہانِ فانی سے کوچ ہی نہ فرما جائیں اس لیے احتیاطاً ان میں سے ایک سو شاعروں کے نام کاٹ دیے گئے۔

افسانہ نگاروں کی فہرست میں اعداد و شمار۔ ایک ہزار چھ سو افسانہ نگار۔ طے کیا گیا کہ سماج وادی نقطۂ نگاہ سے آدھے ایوارڈ ان افسانہ نگاروں کو عطا کیے جائیں جن کے افسانے پڑھ کر قاری سمجھ سکتا ہے اور آدھے ان کو جن کی کہانیاں نہ قاری کی سمجھ میں آتی ہیں نہ افسانہ نگاروں کی سمجھ میں۔

نقّاد حضرات، میں متنازعہ فیہ مسئلہ یہ تھا کہ تعداد اگرچہ زیادہ نہیں تھی لیکن اگر وہ لغات فیروزی اور یوربین نقّادوں کے ادھ بھونڈے نقال نہ ہوتے تو ایوارڈ کے اہل ضرور ٹھہرتے۔ اس لیے یہ تجویز ٹھہری کہ چند نقّادوں کی فہرست بنا کر اسے دانشوروں کے ایک مشاورتی بورڈ کے حوالے کر دیا جائے جو یہ فیصلہ کر سکیں کہ

یہ نقّاد ہیں یا نہیں (المیہ یہ ہوا کہ بورڈ کے ممبروں میں نقّادوں کے نام زیادہ تھے)

طنز و مزاح نگار۔ فہرست اتنی مختصر تھی کہ انھیں ایوارڈ دیتے ہوئے ندامت ہوتی تھی۔ لہذا فہرست بنا کر سبھی نام قلم زد کر دیے گئے ملکھا سنگھ سے سول دار بھی ہوئی کہ وہ میرا نام نہ کاٹنے پر مُصر تھے بلکہ دھمکی تک دے دی گئی کہ اگر یہ نام کاٹا گیا تو وہ ایک لاکھ روپے کی پوری ایوارڈ اسکیم ہی منسوخ کر دیں گے۔

چنانچہ میں ڈپلومیسی کے تحت خاموش رہا۔ سوچا، کہ اب جب کہ اردو ادب کو کینسر لاحق ہو چکا ہے اور صرف ایوارڈوں کی بدولت ہی بے چارے لمحہ بہ لمحہ جی رہے ہیں تو میں کیوں اپنی روح کو اذیت دوں۔ یعنی ملکھا سنگھ کے ایک لاکھ روپیوں سے کینسر کے مریضوں کو سکھ کے چند لمحوں سے محروم کروں۔

محققین۔ اگر محقق نمبر ایک، محقق نمبر دو کی اس تحقیق کو مسترد کر چکا ہو، کہ مرزا غالبؔ کی صحیح سنہ پیدائش کیا تھی۔ اور محقق نمبر تین، دونوں پہلے محققوں کی تاریخ کو ثبوتوں کے لیے غلط قرار دے چکا ہو اور محقق نمبر چار مسترد کرنے کے لیے مزید مسئلہ ثبوت دستیاب کرنے میں مصروف ہو۔ صرف ایسے ہی چار پانچ محقق حضرات کو ایوارڈ کا برابر برابر مستحق قرار دیا جائے۔

انشائیہ نگار۔ فہرست پانچ انشائیہ نگاروں سے آگے نہیں بڑھ سکی کیوں کہ اس صنف میں بھی نقل کے امکان زیادہ پائے گئے۔ لہذا ان پانچوں انشائیہ نگاروں میں سے بھی صرف ایک انشائیہ نگار کی جھولی میں ایوارڈ کی بھیک ڈالی جائے اور وہ قرعہ اندازی کے ذریعے۔ ڈرامہ نگار قصیدہ گو، ناول نویس اور اسی طرح کی پانچ چھ دیگر اصناف کو صرف اتنی رقم کا ایوارڈ دیا جائے کہ جتنی ایک لاکھ روپے میں سے بچ جائے۔ بچی ہوئی رقم میں سیکولرازم اور سوشلزم اس سے بھی کم برت کر برابر بانٹ دی جائے۔

جب فہرست اور اصناف قدرے لمبی ہو گئیں تو میں نے محسوس کیا کہ سردار ملکھا سنگھ کچھ گھبرا سے گئے ہیں بلکہ گھبرائے کم اور بور زیادہ ہو گئے

ہیں۔ میں نے پوچھا "قبلہ سردار صاحب! آپ کچھ ہراساں کیوں ہو گئے ہیں"۔

وہ بولے: "یہ اردو ادب ہے یا شیطان کی آنت؟"

میں نے کہا، "حضور انور! جس دور میں تم شہنشاہ بن کر یہ ادبی وظیفے دے رہے ہو۔ ایسی روایات گزشتہ ادوار کے درباروں میں بھی رہی ہیں۔ صرف دور بدلا ہے گداگری نہیں بدلی اور پھر آجکل تو خدا کی رحمت ہے کہ ادب کم اور اردو زیادہ لکھی جا رہی ہے اس لیے ایوارڈ کی بندر بانٹ کچھ زیادہ مشکل نہیں رہی ہے اور پھر آپ کے جذبات بھی صالح اور نیک ہیں جب کہ شاہی درباروں میں نیکی کا رواج ہی نہیں تھا صرف ادبی خاکسار پیدا کرنے کا نصب العین تھا۔ لہٰذا آپ گھبرائیے نہیں، پسینہ پوچھیے اپنی جبیں سے"۔

اور وہ شاید پسینہ پوچھنے کے لیے اسکاچ وہسکی کی ایک بوتل اٹھالائے اور بولے۔ "آؤ یار! کچھ تسکین قلب کرلیں"۔

میں نے کہا۔ "مگر یہ فہرست ۔۔ ادیبوں تک اطلاع رسانی؟"

"جی، یہ اب دفتری کارروائی ہے۔ یہ سب کچھ اپنے میر منشی دلباغ سنگھ کے سپرد کر دیں گے۔ خط و کتابت کا کام شاہِ وقت نہیں کر سکتے۔ اٹھاؤ اپنا پیگ اور ٹکراؤ"۔

ایک مہینہ کی دفترِ شاہی کے بعد جب کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا کیونکہ یوں لگا کہ ادیب حضرات بہت مصروف ہیں۔ تو میں نے مشورہ دیا:

"سردار جی! کل اپنی کار نکالیے، شہر بھر میں گھوم کر اردو ادیب حضرات سے بالمشافہ تعلقات پیدا کریں گے۔ براہ راست رشتہ ان ادبی ایوارڈوں کے لیے موزوں تکنیک رہے گی"۔

شہر کی سڑکوں پر نکلے تو مجھے یوں لگا جیسے ہر آدمی بھاگم دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے میں مصروف ہے۔ بلکہ کئی بار تو آنکھوں میں ایسا اندھکار

پیدا ہوا کہ دوڑتا ہوا ہر تیسرا آدمی اردو ادیب محسوس ہونے لگا جو یا تو ادبی ایوارڈ کی طرف بھاگ رہا ہے یا ادبی ایوارڈ حاصل کرکے واپس آرہا ہے۔ میں نے دردناک سرگوشی میں کہا:

"سردار ملکھا سنگھ جی! آپ کی ایوارڈ اسکیم کا چانس تو تاریک نظر آرہا ہے۔"

مگر وہ بندہ ــ استحکام اور دلیری کا پتلا۔ کراسنگ پر رُکی ہوئی ایک موٹر کار میں بیٹھے ہوئے شخص کے پاس چلا گیا۔ اور بولا:

"معاف کیجیے، لگتا ہے، آپ اردو کے کوئی بہت بڑے شاعر ہیں۔"

وہ بولا، "اندازہ درست ہے، میری ربڑ کی تین فیکٹریاں ہیں، نظموں اور غزلوں کے چار دیوان ہیں جن پر سات ایوارڈ حاصل کر چکا ہوں۔ آج آٹھواں ایوارڈ لینے جا رہا ہوں۔"

میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ "آپ جائیے، کراسنگ پر ہرے رنگ کی لائٹ ہو گئی ہے۔"

ایک معروف ادیب کی کوٹھی کی بیل بجائی، پہلے اُن کے بل ڈاگ اور پھر ان کی محترمہ نے اطلاع دی کہ وہ شاعری سے توبہ کرکے مشرقِ وسطیٰ میں ایک فرم کے مینیجنگ ڈائریکٹر بن کر چلے گئے ہیں۔ پانچ ادبی ایوارڈ لینے کے بعد ان کے ذہن سے اعلیٰ شعر اگتے ہی نہیں تھے۔ لہٰذا شاعرانہ خزاں سے محفوظ رہنے کے لیے سعودی عرب چلے گئے ہیں۔"

"مایوسی! ملکھا سنگھ جی، مایوسی اے اہلِ نظر کی آبرو، اب گئی سعودی عرب کی طرف۔"

مگر وہ بولے: "آگے چلیے، ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔"

کافی ہاؤس پہنچے، جوان ادیبوں کی آماج گاہ ہے، جنھیں ایوارڈ نہیں ملے صرف ایوارڈوں کی رنج دہ اطلاعات ملتی ہیں۔ کافی ہاؤس کی سیڑھیوں سے تیزی کے ساتھ ایک ناول نگار اترتا نظر آیا۔ میں نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر عرض کیا:

"جناب! ایک ادبی ایوارڈ کی پیش کش کرتا ہوں۔"

کندھا جھٹک کر بولے:

"میرے پاس ٹائم نہیں ہے، مجھے اپنے ایوارڈ شدہ ناول کے جشنِ اجرا پر فوراً پہنچنا ہے۔"

وہ تیزی سے بھاگے تو میں نے پیچھے سے آواز دی:

"آپ دوسرا ناول کب لکھ رہے ہیں؟"

"لکھ لیا ہے مگر اس کے لیے بھی ایوارڈ کی بکنگ پہلے سے ہو چکی ہے۔"

"ہمارے ایوارڈ کی باری کب آئے گی؟"

"تیسرے ناول کا انتظار کیجیے۔"

اور ستاروں سے آگے کے جہاں والا ناول نگار نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

غرض بہبودیٔ اردو ادب کا ایوارڈ نامہ ہاتھ میں لیے، ہم دن بھر مختلف معروف بلکہ غیر معروف ادیبوں کے درِ دولت پر دستک دیتے رہے، مگر کوئی بھی دو تین ہزار روپے سے کم پر آمادہ نہ ہوا۔ کوئی ایوارڈ کے لیے تیزی سے کتاب لکھنے میں مصروف تھا اور کوئی دس بارہ کلاسیکل کتابیں پھیلائے اپنی اوریجنل کتاب تحریر کرنے میں مشغول کوئی کتاب چھپوانے کے لیے پریسوں کے چکّر پر چکّر لگا رہا تھا اور کوئی...... غرض کسی کے پاس بات کرنے کی فرصت تک نہیں تھی۔ یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی تھی کہ ایوارڈوں کی تعداد زیادہ ہے یا ادیبوں کی۔ البتہ ایک جگہ کچھ امید بندھی کہ ایک ادیب کو تین ہزار روپے کا ایوارڈ مل چکا تھا۔ مگر اس نے اپنی بلند سطح پر کھڑے ہو کر یہ کڑی شرط لگا دی کہ اگر آپ مجھے پانچ ہزار روپے کے ایوارڈ کا اعلان کریں تو میں وہ تین ہزار روپے کا ایوارڈ واپس کر دوں گا کہ یہ میری شان کے شایاں نہیں ہے۔

سردار ملکھا سنگھ نے مجھ سے کہا۔ "اس کا نام نوٹ کر لو مشکل سے تو ایک

اسامی ہاتھ آئی ہے۔"

ایک اور افسانہ نگار سے ہم یہ دلدوز چیخ سن کر ملکھا سنگھ کے گھر لوٹ آئے کہ ادبی ایوارڈ والی ایک انجمن نے جس کے چیرمین، امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس میں مسٹر جہاں گیر ہیں۔ اس نے میری کتاب پر پانچ ہزار روپے کا ایوارڈ اس شرط پر دیا کہ چیک ڈھائی ہزار روپے کا ملے گا۔ دستخط پانچ ہزار روپے کی رسید پر کرنا پڑیں گے۔ کتنی شرمناک سچویشن تھی۔

میں نے کہا۔ "کیا دستخط کرتے وقت آپ کو شرم آئی ؟"

"نہیں آئی۔"

"کیوں ؟"

"کیوں کہ آجکل شرم کا نہیں، بے شرمی کا رواج ہے۔"

شام کو روح کی تسکین کے لیے ملکھا سنگھ نے اسکاچ وہسکی کی ایک اور بوتل کھولی۔ پیگ سے پیگ ٹکراتے ہوئے کہنے لگے،

"فکر صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے ؟"

میں نے کہا۔ "میری معلومات تو آپ سے بھی ناقص ہیں۔"

سردار جی نے بُرا نہیں مانا۔ "نہیں نہیں، جو ادیب صرف لکھتے ہی اس لیے ہیں کہ ایوارڈ حاصل کر سکیں ان کے لیے میری ایک لاکھ روپے کی ایوارڈ اسکیم منسوخ۔"

"کیا میں بھی منسوخ جسے آپ نے ایوارڈ دینے کا وعدہ کیا تھا۔؟"

وہ بولے : "ہاں، وہ وعدہ بھی منسوخ کیوں کہ آپ نے تو خود کہا تھا کہ میں نوبل پرائز سے کم کوئی ایوارڈ ہی نہیں لوں گا۔"

فکر تونسوی نے الیکشن لڑا

الیکشن ہار جانے کے بعد فکر تونسوی صاحب اچانک غائب ہو گئے ہیں۔ اُن کی گُم شدگی کے متعلق طرح طرح کی افواہیں اُڑ رہی ہیں۔ کوئی کہتا ہے دریائے جمنا میں ڈوب مرے، کسی نے کہا میں نے انھیں ہمالیہ کی طرف بگ ٹٹ بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک صاحب نے بتایا کہ وہ ریلوے اسٹیشن پر بھیک مانگ رہے تھے اور زار و قطار رو بھی رہے تھے۔

ایک قرض خواہ جب ان کا سامان قرق کرانے پہنچا تو تلاشی کے دوران ان کا ایک مضمون بھی ملا جو انھیں رُسوا کرنے کے لیے ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

اچانک میرے بارے میں افواہ پھیل گئی کہ میں الیکشن لڑ رہا ہوں۔ یہ افواہ سُن کر میرے سسر نے میری بیوی کو ماتمی تار بھیجا، کافی ہاؤس میں میرے دو دوستوں نے ایک دوسرے کو زخمی کر دیا۔ ایک چور نے ٹیلی فون پر مجھ سے شکایت کی کہ ہم تو تمھیں قلاش سمجھ کر تمھارے گھر نقب نہیں لگاتے تھے۔ اب یہ الکشن کے لیے روپیہ کہاں سے آ گیا۔ میرے ایک مخالف امیدوار نے ایک ایمرجنسی میٹنگ بلائی کہ محلّے کے اس واحد بھلے آدمی کو روکا جائے اور اگر نہ مانے تو اسے اغوا کر لیا جائے۔

درحقیقت ہوا یوں کہ جب ملک میں عام چناؤ کی چرچا چلی تو مجھے شرارت سوجھی کہ مندر کے مہنت رنچھوڑ داس کو چناؤ لڑنے پر اُکسایا جائے کیوں کہ ایک تو

اُس کے پاس چڑھاوے کے ہزاروں روپے وافر پڑے تھے جنھیں ختم کرنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ اس کا ٹوٹل مطالعہ ایک گنگا رامائن اور بھجنوں کے سستے ایڈیشن والی کتاب سے آگے نہ بڑھا تھا۔ اسے کامیاب بنا کر میں یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ہماری پارلیمنٹری جمہوریت کس حد تک گر سکتی ہے۔ اس لیے میں نے کہا۔"مہنت جی ملک کی جمہوریت خطرے میں ہے، اسے بچانے کے لیے آپ چناؤ لڑیے!"

مہنت بولا۔"ہی ہی ہی!"

میں نے کہا۔"ہی ہی کا کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔"

"شرمندہ تو وو ٹر ہوں گے۔ آپ کھڑے تو ہو جائیے!"

"نہیں، آپ مجھ سے زیادہ قابل ہیں آپ کھڑے ہو جائیے!"

"مگر قابل آدمی کے پاس موٹر کار نہیں ہے۔"

"میری موٹر کار حاضر ہے۔"

"روپیہ بھی نہیں ہے!"

"بھگوان دے گا!"

"بھگوان کا ایڈریس میرے پاس نہیں ہے۔"

"وہ تو میرے پاس ہے!"

"تو آپ اور بھگوان مشورہ کر کے مجھے آگاہ کر دیجیے گا۔"

میں تو یوں مذاق میں ٹال کر چلا آیا لیکن دوسری شام کو سارے علاقے میں ایک قد آدم پوسٹر چسپاں پایا گیا کہ مہنت رنچھوڑ داس اور اس کی دو ہزار چار سو بیس عقیدت مند بھگتنیوں کی طرف سے شری فکر تونسوی کو الیکشن میں کھڑا ہونے کی درخواست کی گئی جو انھوں نے منظور فرما لی ہے۔

کچھ لوگوں نے اسے مذاق سمجھا۔ میرے سسر نے میری بیوی کو ماتمی تار بھیجا لیکن اس کے باوجود میری بیوی نے سارے محلّے میں لڈو بانٹے، کیوں کہ وہ بھی

مہنت رنچھوڑ داس کی چیلی تھی۔ جب اپنی بیوی ہی مہنتوں کے بس میں ہو تو پولیٹیکل سوجھ بوجھ بے معنی ہو جاتی ہے۔

جس دن کاغذاتِ نامزدگی داخل کرنے کی آخری تاریخ تھی میں صبح ہی صبح باتھ روم میں جا چھپا۔ لیکن میری بیوی اور احباب نے اسپیشل پولیس اسکوئڈ کو بلایا اور اس کی مدد سے دروازہ توڑ کر مجھے باہر نکالا۔ باتھ روم کے باہر ہی ایک دوست نے الیکشن فنڈ کے لیے اپیل جاری کر دی اور گیارہ روپے بھی دے دیے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو ہزار روپے اکٹھے ہو گئے، جن میں پچانوے روپے نقد تھے اور باقی کے وعدے تھے ان پچانوے روپوں میں تین نوٹ پھٹے ہوئے تھے۔

اس پر پروپیگنڈہ مشینری فوراً حرکت میں آگئی اور ووٹروں میں کنویسنگ کی گئی۔ ایک دوست نے کونے میں لے جا کر سمجھایا کہ کامیاب ہونے کے بعد تمہارے وزیر بننے کے چانس خاصے روشن ہیں۔ ایک جیوتشی کو بلایا گیا۔ جس نے پانچ روپے لے کر زائچہ بنایا کہ قسمت کے ستارے میں ایک کار اور کوٹھی صاف بیٹھی ہوئی نظر آرہی ہے ڈیری آنرز یونین کے پریذیڈنٹ شری نیت رام نے پانی ملا ہوا دودھ کا گلاس میرے منہ سے لگاتے ہوئے کہا: "الیکشن میں دودھ کا سارا خرچہ میرے ذمے!" ایک اور صاحب نے وعدہ کیا کہ الیکشن آفس کے لیے میری کوٹھی حاضر ہے۔ (یہ کہنے کے بعد وہ صاحب کبھی نظر نہ آئے)۔

ان حوصلہ افزائیوں نے میرا ایمان متزلزل کر دیا، میرا خیال تھا کہ الیکشن لڑنا شرفا کا کام نہیں۔ لیکن اب خیال آیا کہ صرف شرفا ہی کو لڑنا چاہیے ورنہ ڈیموکریسی غنڈہ گردی کا شکار ہو جائے گی۔ اس لیے جوں ہی میں نے ہامی بھری مجمع میں ایک عجیب سی احمقانہ طمانیت بھر گئی اور ایک مشٹنڈے سے نوجوان نے جو رام لیلا میں راون کا پارٹ ادا کیا کرتا تھا مجھے پکڑ کر کندھے پر بٹھا لیا تھا اور مجھے ایسا

محسوس ہوا جیسے میں راماین کی سیتا ہوں اور ڈیموکریسی کا راون مجھے اغوا کر کے لے جا رہا ہے۔

دوسری رات کو احباب نے ایک ایمرجنسی میٹنگ بلائی۔ پچاس دوستوں نے وعدہ کیا تھا لیکن صرف پچیس شامل ہوئے، باقی پچیس میں سے کوئی خود بھاگ گیا تھا، کسی کی بیوی بھاگ گئی اور کسی کی بھینس! ایک لیڈی ورکر جو ایک بار جوئے کے جرم میں گرفتار ہو چکی تھی اس میٹنگ میں شامل ہوئی۔ ایک لیڈی ڈاکٹر جو فیملی پلاننگ اور اسقاط حمل دونوں کام ساتھ ساتھ کرتی تھی میری مداح نکلی، الیکشن کے ایک گھاگ ماہر نتری بدلی چند جی نے اس میٹنگ کی رہنمائی کی۔ یہ صاحب چار بار الیکشن لڑ چکے تھے جن میں سے تین بار ہار گئے تھے اور چوتھی بار ایک ٹکنیکل غلطی کی وجہ سے کامیاب ہو گئے تھے۔ بدلی چند جی نے مہتو اپدیش سے لے کر دیوانِ چرکین تک کے حوالے دے دے کر بتایا کہ الیکشن میں کس قسم کی حکمت عملیوں سے کام لینا چاہیے۔ انھوں نے انکشاف کیا کہ ہر الیکشن پر میری جیب سے صرف پچیس روپے خرچ ہوئے تھے باقی سبھی اخراجات ووٹروں نے برداشت کیے تھے۔ اس انکشاف کا میری الیکشن مہم پر بہت برا اثر پڑا کیوں کہ کئی دوستوں نے اپنے وعدے کے روپے دینے سے انکار کر دیا کہ ووٹر خود برداشت کریں گے اور ایک دوست نے تو اپنے دیے ہوئے پانچ روپوں کی واپسی کا مطالبہ بھی کر دیا۔

اس ہائی پاور میٹنگ میں ایک الیکشن کمیٹی بنائی۔ اس کمیٹی کو تمام اختیارات سونپ دیے گئے کہ وہ جیسے چاہے الیکشن مہم چلائے۔ پوسٹر نکالے، نہ نکالے، جلسے کرے، نہ کرے، مخالف کے جلسوں میں گڑبڑ پھیلائے، جلوس نکالے، کرایے پر مظاہرین حاصل کرے، اپنے امیدوار میں وہ خوبیاں تلاش کرے جو اس میں موجود نہ ہوں اور مخالف امیدوار کے لیے وہ خرابیاں ایجاد کرے جو اس میں موجود نہ ہوں جعلی ووٹروں کی الگ فہرست تیار کرے۔ جوئے میں سزا یافتہ لیڈی ورکر کو زنانہ

ووٹروں کے محاذ کی انچارج بنا دیا گیا۔ میری ناکامی کی ایک اہم وجہ یہی جُوئے باز محترمہ تھیں، کیوں کہ یہ جس عورت کے پاس بھی کنویسنگ کے لیے جاتی وہ منھ پھیر لیتی اور مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ عورتیں، عورتوں سے کتنی نفرت کرتی ہیں۔

جب میرے الیکشن کا پہلا پوسٹر نکلا تو کھلبلی مچ گئی کیوں کہ وہ اشتہار نہیں تھا ایک ادب پارہ تھا۔ اس ادب پارے کو پانچ فی صدی لوگ سمجھے۔ پچانوے فی صدی نہیں سمجھے۔ میری ضمانت ضبط ہونے کی ایک اور وجہ یہ پوسٹر بھی تھا۔ جس نے میرے ووٹروں کو پانچ اور پچانوے میں بانٹ دیا اور دونوں نے مجھے ووٹ نہیں دیا۔ سمجھ داروں نے اپنی سمجھ کے زعم میں اور ناسمجھوں نے "بے ادب" ہونے کے ناطے! اور جن چند عورتوں نے مجھے ووٹ دیا ان کی زبانی پتہ چلا کہ انھوں نے مجھ پر رحم کھا کر ووٹ دیا۔ سچ مچ دنیا میں رحم دل انسان اب بھی موجود ہیں۔

میرا خاکہ اڑانے کے لیے نہیں بلکہ عادتاً مخالف امیدوار نے بھی جوابی پوسٹر نکالا جن میں مجھ پر کچھ الزامات لگائے۔ مثلاً:

۱۔ میں کوٹ پہنتا ہوں۔

۲۔ میری بینائی کمزور ہے۔

۳۔ میں نے محلّے کے کتّے کو زہر دلوا دیا تھا۔

۴۔ میں نے مندر کی تعمیر کے لیے سوا روپیہ چندہ نہیں دیا تھا۔

۵۔ میں دودھ میں ملاوٹ کا دشمن ہو کر بھی اپنے بچّوں کو دودھ میں پانی ملا کر پلاتا تھا۔

جب یہ پوسٹر شائع ہوا تو پچانوے فی صدی ووٹروں کی سمجھ میں آسانی سے آگیا اس پوسٹر نے ذہنی طور پر قریب قریب مجھے مفلوج کر دیا۔ غصّے اور اضطراب سے نیند اُڑ گئی۔ الزامات صحیح ضرور تھے لیکن معیاری نہ تھے۔ احباب نے مجھے مجبور کیا کہ

ہیں بھی مخالف امیدوار پر جوابی الزامات لگاؤں۔ مثلاً یہ کہ اُس نے مندر کے تہہ خانے میں ناجائز شراب کی بھٹی چلا رکھی ہے۔ اس کے والد صاحب نائی تھے۔ اُس کی موجودہ بیوی اغوا شدہ ہے۔ اس کا دادا برٹش سرکار کا پٹھو تھا یعنی سرکار کا چپراسی تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ الزامات میرے الزامات سے بھی گرے ہوئے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ الیکشن نہ لڑوں گا اور ٹانگانیکا چلا جاؤں گا۔ جب میں نے بیوی سے اس کا ذکر کیا تو وہ بولی:

"میں بھی تمھارے ساتھ ٹانگانیکا چلوں گی۔"

میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا:

"تو محترمہ! الیکشن لڑنا کیا بُرا ہے؟"

تیسرے دن ہمارا انتخابی جلوس نکالا گیا۔ میرا انتخابی نشان مرغا تھا۔ ایک صاحب نے تجویز کیا کہ ایک سو ایک مرغے خریدے جائیں۔ ہر مرغے کو بائیسکل کی گدّی پر بٹھا کر ان کا جلوس نکالا جائے۔ تجویز بہت اچھوتی تھی لیکن کسی ستم گر مرغی خانے کے مالکوں تک یہ اطّلاع پہنچادی تو مارکیٹ میں مرغوں کا نرخ سات روپے سے دس روپے ہوگیا۔ بیوی نے پیش کش کی کہ میرے طلائی زیور بیچ کر مرغے خرید کر لیجیے۔ میرا گلا بھر آیا۔ قربانی کی یہ مثال صرف انقلاب فرانس میں ملتی ہے۔ انقلابی اسپرٹ کے تحت ایک سو ایک مرغوں کا جلوس بڑے کرّوفر سے نکلا۔ ایک سو ایک بائیسکلیں اور ان پر گدی نشین ایک سو ایک مرغے اور انھیں سنبھالنے کے لیے ایک سو ایک ورکر۔ اس جلوس پر مخالفوں نے پتھر اور حمایتیوں نے پھول برسائے۔ جلوس میں مرغ اور انسان دونوں شامل ہوئے۔ جلوس کے آگے آگے ککڑوں کوں کا ایک ریکارڈ برابر بج رہا تھا اور عوام نعرے لگا رہے تھے۔

جیتے گا بھائی جیتے گا!

مرغے والا جیتے گا۔!!

جلوس کے خاتمے پر معلوم ہوا کہ دس بائیسکلیں اور پندرہ مرغے غائب ہیں کچھ ورکروں نے بتایا کہ چار پانچ مرغے تو مرغیوں کے پیچھے بھاگ گئے۔ کچھ ورکر جو بے ایمان تھے جلوس کے درمیان ہی سے کچھ بائیسکلیں لے کر کھسک گئے۔

تین دن بعد مخالف امیدوار نے بھی جلوس نکالا۔ اس کا انتخابی نشان بھینس تھا۔ انھوں نے بھی ایک سو ایک بھینسوں کا جلوس نکالا۔ عوام اس جلوس میں بھی ہزاروں کی تعداد میں شامل ہوئے ان عوام کا کوئی اعتبار نہیں۔ مرغے اور بھینس دونوں سے یکساں عقیدت رکھتے ہیں۔ عوام کے اس دوغلے پن پر میں کباب ہو گیا صرف ایک بات اطمینان بخش تھی کہ مخالف کی آٹھ بھینسیں غائب ہوئیں جن کی قیمت مرغوں سے سات سو گنا زیادہ تھی۔

اس کے بعد جلسوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ امر تعجب خیز تھا کہ مرغوں کی طرح مقررین بھی کرائے پر چل جاتے تھے۔ شاعر اور موسیقار ایک جلسے سے فارغ ہو کر دوسرے جلسے میں پہنچ جاتے۔ صرف امیدواروں کے نام بدل دیتے مواد وہی رہنے دیتے۔ آرٹ اور آرٹسٹوں کی یہ "پیسہ پرستی" دیکھ کر کئی بار مجھے شرم آئی لیکن احباب نے سمجھایا کہ یہ صنعتی دور ہے۔ یہاں آرٹ بھی بازار کی جنس بن گیا ہے۔ ہلدی، آلو، ٹماٹر، گڑ اور شعر۔ ان سب میں بھید بھاؤ مٹ گیا ہے۔

ہمارے حلقے میں چوبیس ہزار ووٹر تھے جن میں سے ڈھائی ہزار ووٹر جعلی تھے یعنی خدا کی طرح موجود تھے لیکن نظر نہیں آتے تھے۔ ایک صاحب میرے پاس آئے اور بولے:

"ان ڈھائی ہزار ووٹروں کا ٹھیکہ مجھے دے دیا جائے، ڈھائی ہزار روپے لے کر ووٹ بھگتا دوں گا۔"

بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایسا ہی ٹھیکہ مخالف امیدوار سے بھی کر چکا ہے

اور ڈھائی ہزار روپے لے چکا ہے۔ میں نے اسے بُلا کر شرمندہ کیا لیکن وہ شرمندہ نہ ہوا اور کہنے لگا:

شرمندگی کیسی؟ یہ تو بزنس ہے۔"

ایک ہزار ووٹر رحلت فرما گئے تھے جس سے مجھے بہت تسکین ہوئی، کیوں کہ ووٹر جتنے بھی کم ہوں اتنی زحمت کم ہوتی ہے کیوں کہ ہر ووٹر کے پاس جا جا کر ہاتھ جوڑنا پڑتے ہیں۔ الیکشن کی اصطلاح میں اسے "ڈور ٹو ڈور کنویسنگ" یعنی دردر کی خاک چھاننا کہتے ہیں۔ میں نے کئی ایسے ووٹروں کے سامنے بھی ہاتھ جوڑے جو اندھے تھے، ایسے ووٹروں کو اپنا مینی فیسٹو سنایا جو بہرے تھے۔ اس کنویسنگ میں محلّے کے جو معزّزین ہمارے ساتھ چلتے وہ مخالف امیدوار کے ساتھ بھی چلا کرتے۔ ان میں سے ایک معزّز نے مجھے کان میں بتایا کہ ہم صرف اخلاق اور تہذیب کی خاطر مخالف امیدوار کے ساتھ جاتے ہیں ورنہ ہم ووٹ آپ ہی کو دیں گے۔

اور ان میں سے اکثر معزّزین نے ہم دونوں میں سے کسی کو بھی ووٹ نہیں دیا۔ پولنگ کے دن یا تو وہ باہر چلے گئے یا تاش کھیلتے رہے۔

پولنگ سے دو دن پہلے سرگرمیاں کچھ زیادہ تیز ہو گئیں مثلاً مخالف امیدوار کے ایک خاص ایلچی نے رات کے دو بجے آ کر میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے پوچھا:

"کیا چاہتے ہو؟"

وہ بولا، "آپ کا ضمیر!"

میں نے کہا۔ "ذرا وضاحت فرمائیے۔"

اور اس نے بطور وضاحت پانچ ہزار روپے کے نوٹ میری جیب میں ڈال دیے۔ میں نے کلی کی طرح تبسّم کیا اور کہا کہ نرخ بالا کن۔ وہ اُداس ہو گیا بولا:

"مالک نے مجھے چھ ہزار روپے دیے ہیں۔ ایک ہزار میں نے بطور کمیشن رکھ لیا ہے۔"

میں نے یہ سُن کر اپنے کتّے سے کہا۔

"ان صاحب کو گھر چھوڑ آؤ"۔

دوسرا انکشاف یہ ہوا کہ تمام سبزخوروں نے مندر میں جاکر قسم کھائی کہ مرغا ایک طرح کا مانس ہے۔ اس لیے کوئی سبزی خور مرغے کو ووٹ نہ دے گا۔ لیکن مندر کے ہیڈ پجاری نے پچاس روپے میں اپنا ضمیر بیچتے ہوئے بتایا کہ جب قسم کھائی گئی اس وقت بھگوان کی مورتی کو نہلایا نہیں گیا تھا۔ اس لیے قسم کا قبول ہونا مشکوک ہے۔

تیسرا انکشاف یہ ہوا کہ ووٹر کی کوئی ذاتی رائے نہیں ہوتی، بلکہ مختلف ٹولیوں، فرقوں، ذاتوں اور برادریوں کی رائے ہی اس کی رائے ہوتی ہے۔ ترکمان برادری، گوالا برادری، جوئے باز برادری، چڑی مار برادری، کبوتر برادری۔ غرض ان گنت برادریوں میں ووٹر حضرات کی تقسیم در تقسیم ہو چکی ہے۔ میں نے افراد کی بجائے برادریوں سے التجا کی کہ میں بھی آپ ہی کی برادری کا ممبر ہوں۔ ممبر بنانے کے بعد انھوں نے وعدہ کیا کہ ہم آپ ہی کو ووٹ دیں گے۔ مخالف امیدوار سے بھی ایسا ہی برادرانہ وعدہ کیا گیا۔

اور سب سے آخری اور عظیم انکشاف یہ ہوا کہ جب پولنگ کے بعد ووٹوں کی گنتی کی گئی تو میری بیوی کے سوا کسی کو یقین نہ آیا کہ میری ضمانت ضبط ہو گئی ہے لیکن مجھے برابر یہ شک رہا کہ میری بیوی نے بھی مجھے ووٹ نہیں دیا۔ بدنیتی سے نہیں لاعلمی سے!!

مجھے قتل کر دو

جب شہر میں آئے دن قتل کی وارداتیں ہونے لگیں، تو بے اختیار میرا جی چاہا کیوں نہ میں بھی قتل ہو جاؤں۔ شہر کے ہر معاملے سے میرا رابطہ رہا ہے تو اس معاملے میں شہر سے کیوں بچھڑ جاؤں چنانچہ صبح کی سیر سے لوٹتے ہوئے ایک دو آدمیوں سے پوچھا بھی کہ مجھے قتل کر ڈالو۔ لیکن ایک نے جواب دیا کہ آج میں ایک قتل کر کے آ رہا ہوں اور میں ہفتہ میں صرف ایک قتل کرتا ہوں۔ باقی چھ دن عبادتِ خدا میں صرف کرتا ہوں۔ لہذا آپ کو قتل کرنے کا موقع آئندہ ہفتے دے سکتا ہوں۔

دوسرے آدمی سے گزارش کی تو وہ بولا: "میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ میں اپنے کام کے سلسلے میں ایک سرکاری افسر کے گھر رشوت دینے جا رہا ہوں۔ رشوت قتل سے زیادہ فائدہ مند ہے۔"

اگرچہ ان کورے جوابوں سے قدرے اُداس ضرور ہوا لیکن کر ہمّت باندھے رکھی۔ ارادہ جینوئن ہو تو اس کی تکمیل میں کوئی سدِّ راہ نہیں ہو سکتا ہر روز اخبار میں دو چار قتلوں کی خبریں پڑھتا تو میرا حوصلہ اور بلند ہو جاتا لیکن صرف حوصلے سے کچھ نہیں بنتا۔ قتل ہونے کے لیے قاتل کا ہونا ضروری ہے ــــ اور قاتل . . . . ! مگر قاتل کہاں سے لاؤں۔؟

آخر ایک دن بیوی سے کہا۔ "جانِ من" کیا تمھیں معلوم ہے کہ شہر میں آج کل بہت قتل ہو رہے ہیں؟"

وہ بولی۔ "ہاں ہو رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تو کیوں نہ ہم دونوں بھی قتل ہو جائیں کیوں کہ دونوں جیون ساتھی ہیں۔ کرپٹ اور بددیانت سماج میں خواہ مخواہ جی رہے ہیں۔ اس سے تو بہتر ہے قتل ہو جائیں۔"

یہ سن کر بیوی شش و پنج میں پڑ گئی۔ مگر پھر قدرے توقف سے بولی:

"آپ کا حکم سر ماتھے پر۔ لیکن پھر سوچتی ہوں اگر آپ کے ساتھ میں بھی قتل ہو گئی تو آپ کا سیاپہ خلوصِ دل سے کون کرے گا۔ ہماری تہذیب کی صدیوں سے یہی روایت ہے کہ خاوند کے سیاپے کے لیے بیوی کا زندہ رہنا ضروری ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟ ویسے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

بیوی نے تہذیب کی آڑ لی تو مجھے اُس کا جیون ساتھی ہونا مشکوک نظر آیا۔ جب گھر کے آدمی ساتھ نہ دیں تو کسی غیر سے کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ کفِ افسوس مل کر غصّے سے کہہ دیا۔

"تمھیں دراصل بیوہ کہلانے کا شوق ہے تو انشاء اللہ دو چار دنوں میں پورے بول حفظ کر لو۔ میں قتل ہونے کی خواہش کو روک نہیں سکتا۔"

اور میں قتل ہونے کے لیے گھر سے باہر نکل گیا۔

میرے گھر سے پندرہ بیس گز کے فاصلے پر پڑوسی جگن ناتھ جی کا مکان تھا۔ مکان کے باہر گتّے پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ "قاتل صاحبان یہاں پانچ دن پہلے ایک قتل ہو چکا ہے۔ براہِ کرم اب کسی اور گھر رجوع کیجیے۔"

بورڈ پڑھتے ہی میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ جگن ناتھ ایک بڑے اسمگلر کا چمچہ تھا۔ میٹرک فیل تھا۔ مگر کتنا خوش نصیب تھا کہ قاتل وہاں ایک قتل کر گئے۔ مگر میرے نصیب میں کوئی قاتل ہی نہیں، بزرگوں نے سچ کہا تھا کہ:

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے

جگن ناتھ سے میری بول چال بند تھی، کیوں کہ اسمگلنگ کو میں فعلِ قبیح سمجھتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں نے اس کے گھر کی کال بیل بجائی تاکہ اس سے معلوم کروں کہ آپ کے ہاں جو قاتل آیا تھا اس کا ایڈریس اور حلیہ ہی عنایت کر دیجیے۔ میں حاجت مند تھا اور حاجت مند تو چور کو بھی تھانے دار کہہ دیتا ہے۔

جگن ناتھ جی نمودار ہوئے۔ میں نے گلوگیر لہجے میں پوچھا۔ "قبلہ! آپ کے ہاں کس کا قتل ہوا ہے؟"

وہ بولا: "میرے چھوٹے بھائی کا۔ وہ بالکل معصوم اور بے گناہ تھا جی! اس سے تو بہتر تھا قاتل مجھے قتل کر جاتا۔ اور جی! دراصل وہ قتل مجھے کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ..... اب پوچھو مت جی! قاتل نے ہمارے گھر سے ایک امپورٹڈ وی سی آر اٹھایا میرا بھائی اور اس کی بیوی وی سی آر چھیننے کے لیے آگے بڑھے تو قاتل نے میرے بھائی بے چارے پر گولی چلا کر اُسے ڈھیر کر دیا پھر اس کی بیوی کو چھوڑ گئے وی سی آر لے گئے۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا قاتل بڑا دانا معلوم ہوتا ہے۔ کام کی چیز لے گیا بے کار چیز چھوڑ گیا۔ میں نے جگن ناتھ جی سے پوچھا۔

"قاتل کا نام کیا تھا؟"

وہ بولے: "نام نہیں بتایا۔"

میں نے پوچھا:

"مگر آپ نے جو باہر بورڈ لگا رکھا ہے، وہ کون پڑھ سکے گا، قاتل حضرات تو اَن پڑھ ہوتے ہیں۔"

"ارے نہیں صاحب! آپ کس زمانے کی بات کر رہے ہیں۔ آج کل تو گریجویٹ اور ایم۔ اے پاس نوجوان تک قتل کرتے پھرتے ہیں۔ قتل کے بعد کار پر ہی لوٹ جاتے ہیں اور کسی ویران جگہ پر جا کر کار کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔"

"کار کو کیوں؟"

"کیوں کہ کار بھی چوری کی ہوتی ہے۔"

مجھے حکن ناتھ سے بھی بڑی مایوسی ہوئی۔ گھر میں قتل ہوا اور قاتل کا نام تک معلوم نہیں کر سکے۔ تھانے میں نامعلوم قاتل کے خلاف ایف۔آئی۔آر درج کر کے خاموش ہو گئے اور چوری چھپے پھر اسمگلنگ کے دھندے میں لگ گئے۔

چنانچہ میں نے یاسیت کے عالم میں پولیس ہیڈکوارٹر کو پبلک بوتھ سے ٹیلی فون کیا۔ وہاں ایک پولیس افسر میرے کلاس فیلو تھے سوچا، شاید وہی میرے لیے کوئی قاتل مہیا کر سکیں۔ ٹیلی فون پر عرض کیا۔ "ہیلو بھرت لال جی! میرا قتل ہونے کا پروگرام ہے، کیا آپ کے پاس کوئی قاتل دستیاب ہو سکتا ہے؟

جواب آیا۔ "ویری سوری قاتل تو کوئی موجود نہیں ہے کوئی اور خدمت بتائیے۔"

جی چاہا کہہ دوں، تم ہی آ کر مجھے قتل کر دو۔ تمھارے پاس پستول بھی موجود ہے۔ لیکن اتنی صاف گوئی کی جرأت نہیں ہوئی۔ پوچھا:

"کیا آپ کو معلوم ہے، شہر میں قتل کی بہت سی وارداتیں ہو رہی ہیں؟"

وہ بولے۔ "ہاں ہو رہی ہیں۔"

"تو پھر آپ کوئی قاتل گرفتار نہیں کر سکے؟"

کہنے لگا۔ "ارے بابا! یہی تو مصیبت ہے۔ جب بھی کسی موقع واردات پر پہنچتے ہیں قاتل بھاگ چکے ہوتے ہیں۔"

"آپ گھر سے لیٹ چلتے ہوں گے۔"

"اجی کیا کریں، ہمارے قواعد وضوابط ہی ایسے ہیں۔"

میں نے پھر اپنی معلومات کے لیے پوچھ لیا۔ "لیکن یہ تو آپ معلوم کر سکے ہوں گے کہ قتل کی یہ مسلسل وارداتیں کیوں ہو رہی ہیں؟"

وہ بولا۔ پانچ بڑے پولیس افسروں کی ہائی پاور کمیٹی بنا دی گئی ہے، جو ان وارداتوں کے پس منظر کی رپورٹ تیار کرے گی۔ مگر آپ کیوں قتل ہونے کے لیے

بے چین ہو رہے ہیں ؟"

"جی اوب گیا ہے دنیا سے۔"

"تو پھر خدا سے دعا کیجیے۔ اس کے پاس قاتلوں کی کوئی کمی نہیں۔"

"وہ بھی کر چکا۔ مگر لگتا ہے، خدا بھی غیر جانب دار ہو گیا ہے۔"

اس نے یہ کہہ کر مجھے تسلّی دی کہ آٹھ دس دن انتظار کیجیے، شاید میں کسی قاتل کا پربندھ کر کے آپ کی خدمت میں بھیج سکوں۔

قاتل کی تلاش میں بڑی مشکل پیش آ رہی تھی اور قاتل کے بغیر قتل ہونا بالکل ایسے تھا جیسے پانی ملے دودھ کی چھاچھ میں سے مکھن نکالنا۔ مگر اس کے باوجود ہر روز ایک دو قتل ہونے کی خبریں آ رہی تھیں۔ گورنمنٹ ہر روز بیان دے رہی تھی کہ قاتلوں کی کھوج مسلسل جاری ہے۔ مگر اس سلسلے میں عوام کو بھی گورنمنٹ سے تعاون کرنا چاہیے۔ شاید مطلب یہ تھا کہ جو آدمی قتل ہونے لگے مرنے سے پہلے گورنمنٹ کو قاتل کا حُلیہ ضرور بتا جائے۔

اچانک خیال آیا۔ شو بھانند کرائم برانچ رپورٹر سے رجوع کیا جائے یقیناً وہ کوئی معقول قاتل مجھے تلاش کر دے گا۔ چنانچہ اُس کے گھر میں ٹیلی فون کیا۔

"ہیلو! مجھے شو بھانند جی سے ملا دیجیے۔"

بھرّائے ہوئے گلے والی زنانہ آواز نے جواب دیا۔ "آہ! وہ پرسوں قتل ہو چکے ہیں۔"

"کس نے قتل کیا بھابی؟"

"قاتل نے۔"

ہائے! شو بھانند کتنا خوش نصیب نکلا۔ مجھ سے بازی لے گیا اور قاتل کتنا کور ذوق تھا۔ ضرورت مجھے تھی، قتل اُسے کر گیا۔ لیکن اس کور ذوقی سے اتنا شعور ضرور ہو گیا کہ شو بھانند نے قاتلوں کے خلاف کوئی رپورٹ شائع کی ہو گی،

جبھی اسے گولڈن چانس مل گیا۔

مگر ان متواتر مایوسیوں کے باوجود میرے قتل ہونے کا جذبہ ابھی تک مضبوط تھا۔ سمندر میں قاتلوں کی پے در پے طوفانی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ مجھے شہر کا پورا چکر لگانا چاہیے۔ کوئی وجہ نہیں کہ کوئی قاتل لہر مجھے بھی سرفراز کر دے۔ چاہے وہ لہر تیسرے درجے کی گھٹیا لہر ہی کیوں نہ ہو۔

چنانچہ گھومتے گھومتے ایک فٹ پاتھ پر ایک مونچھل آدمی سے پوچھا:

"اے مشفق مہربان! کیا آپ کی جیب میں پستول ہے؟"

وہ بولا۔ "جی نہیں، میرے پاس تو نہیں ہے۔ مگر میرے والد صاحب کے پاس تھا۔"

"وہ کہاں رہتے ہیں؟"

"وہ پرلوک سدھار گئے۔ مگر آپ پستول کے متعلق کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"آپ کی مونچھیں دیکھ کر میں ڈر گیا کہ آپ کے پاس پستول ضرور ہوگا جس سے آپ مجھے قتل کر دیں گے۔"

"ہی ہی ہی۔ مہربان! آپ بہت لیٹ ہو گئے۔ آج سے پانچ برس پہلے اپنا یہی پیشہ تھا لیکن ترک کر دیا۔ آج کل تو میں سبزی منڈی سے سیب خرید کر اپنی دوکان پر بیچتا ہوں۔"

شاید اُسے سبزی منڈی جانے کی جلدی تھی۔ اس لیے مزید تضییع اوقات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ چند منٹ کے کرب کے بعد مجھے ادھیڑ عمر کی عورت نظر آئی جو اندر اور باہر سے سرسبز تھی لیکن مالا جپتے ہوئے آ رہی تھی۔ میں نے سوچا امید نہیں چھوڑنی چاہیے۔ کئی مالا والی عورتیں بھی بڑی خونخوار ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس کے قریب پہنچا تو تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ حیران مگر میں بے تاب۔ فوراً پوچھا:

"حضور! کیا آپ مجھے قتل کر سکتی ہیں؟"

وہ مسکرا کر بولی:

"کیا آپ شاعر تو نہیں ہیں"

"تھا کسی زمانے میں۔ لیکن اب صرف اپنا غیر شاعرانہ قتل چاہتا ہوں"۔

وہ مجھے کوئی پاگل سمجھی۔ ٹاٹا کرتے ہوئے کہتی ہوئی گئی۔

"قہ قہ قہ۔ مجھے آج ایک نہایت ضروری شاپنگ کرنا ہے، قتل کے لیے پھر کبھی سہی"۔

آپ یہ مت پوچھیے کہ میں نے شہر کے آٹھ دس راہ گیروں سے پوچھا کہ از راہِ کرم مجھے قتل کرنا پسند کریں گے۔ مگر وہ میری بات سنتے ہی بھاگ گئے جب کہ ایک آدمی کو تو ہارٹ اٹیک ہو گیا اور ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ ایک بہت بڑے ساہوکار تک کی منت سماجت کی جو تاجرانہ منافقت کے باعث دو چار پیشہ ور قاتل رکھ لیتے ہیں اور مخالف تاجر کو ہلاک کرا دیتے ہیں۔ لیکن وہ ساہوکار بھی مکر گیا کہ میں ایسا مکروہ دھندہ نہیں کرتا۔ میں تو ہر ماہ ویشنو دیوی کی یاترا پر جاتا ہوں۔

غرض حالات کو ناسازگار پا کر سڑک پر بیٹھے ایک بھکاری کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ کافی تنومند بھکاری تھا، کیا اس کی منت سماجت کروں ؟ مگر نہیں، اچانک خیال آیا اسے فحش گالیاں دوں۔ کون جانے غصّہ میں آجائے اور چاقو نکال کر مجھے بھونک دے۔ چاقو اب اتنے عام ہو گئے ہیں کہ سائیکل رکشا پولر سے لے کر بھکاری تک جیب میں رکھنے لگے ہیں۔ چنانچہ میں نے چھوٹتے ہی اسے کہا۔

"کمینے، سور کے بچّے! بھیک مانگتے ہوئے شرم نہیں آتی ؟"

وہ بولا، "جاؤ جاؤ معاف کرو بابا"۔

"معاف کرو کا کیا مطلب ؟ کُتّے کے تخم! کیا مجھے بھی اپنی طرح بھکاری سمجھے ہو، کلّے چیر دوں تمھارے ؟"

ایک دم بھکاری بھڑک اٹھا۔

"میرے کلیجے؟ تمھارا چڑیا اتنا جسم ہے اور میرے ایسے لوہے اور پتھر کے کلیجے چیرو گے؟"

میں نے محسوس کیا اب کام بن گیا۔

"ارے چڑیا ہوگی تمھاری ماں! میں تو تیرا خون پی جاؤں گا۔ اٹھ کر سامنے تو آجا! کیا تیرے پاس چاقو ہے؟"

وہ بولا "نہیں ہے۔"

"چلو! سامنے دکان سے تمھیں چاقو خرید دوں گا، تمھیں چاقو پکڑنا بھی آتا ہے، کبھی کسی کو قتل بھی کیا ہے حرام زادے؟"

وہ بولا۔ "گالیاں بند کرو چاقو لے دو، مگر قتل ہونے سے پہلے اپنی بیوی کا ایڈریس بھی دے جانا۔ تاکہ تمھاری لاش اس کے حوالے کر دوں اور خود روپوش ہو جاؤں۔"

میں نے سوچا، سالا بڑا تجربہ کار قاتل معلوم ہوتا ہے۔ پیچھے سنا تھا کہ سرکار نے تمام بھکاریوں کو شہر بدر کر دیا ہے۔ لیکن اب لگا کہ شہر میں جتنے قاتل کام کر رہے ہیں وہ سبھی بدر شدہ بھکاری ہوں۔ روزی روٹی کے لیے انسان کبھی بھکاری بن جاتا ہے کبھی قاتل۔ چلو، گندی اور فحش گالیوں کا آئیڈیا بُرا نہیں رہا۔ اتنی جد و جہد کے بعد کم از کم ایک قاتل تو ملا۔ جد و جہد ایمان داری سے کی جائے تو اس کا میٹھا پھل ضرور ملتا ہے، میرے لیے یہ بھکاری نہیں ہے، میٹھا پھل ہے۔ میں جانتا تھا چند گز کے فاصلے پر رام پوری تیز چاقوؤں کی ایک دوکان کا مالک میرا دوست اور مدّاح تھا۔ ایک مرتبہ اس نے مجھ سے کہا تھا۔ "فکر صاحب! کیا آپ کو اعلیٰ کوالٹی کا ایک چاقو بہ طور تحفہ دے دوں؟"

اور میں نے مذاق میں اس سے کہا تھا۔ "چاقو دینا ہے تو ایک پیٹ بھی ساتھ ہی دیجیے، جسے میں بھونک سکوں۔"

بہرکیف اس وقت تو بات ہنسی میں ٹل گئی۔ لیکن آج سیریس معاملہ تھا۔ قاتل کو اپنے قتل کے لیے چاقو بھی خود خرید کر دینا پڑ رہا تھا۔ پیٹ بھی میرا اور چاقو بھی میرا۔ تین چار منٹ میں اس دوکان پر پہنچا۔ علیک سلیک کے بعد اس سے تیز دھار چاقو طلب کیا۔ اس نے چاقو کی بجائے کمپا کولا کی بوتل پیش کر دی۔ میں نے کہا:

"پیارے بوتل کا عشق فی الحال ملتوی رکھو، مجھے فوراً چاقو چاہیے، ذرا جلدی ہے۔"

وہ ہنس کر بولا:

"جلدی کیا ہے۔ کیا کوئی بینک لوٹنا ہے؟"

میں چُپ رہا۔

"کیا کسی جیولری شاپ پر حملہ کرنا ہے؟"

میں بدستور چُپ رہا۔

"تو کیا کسی انتہا پسند گروہ کے ممبر بن گئے ہو؟"

میں چُپ رہا۔ میری مسلسل خاموشی سے پریشان ہو کر اس نے اپنے ہاتھ سے ایک تیکھا، چمک دار چاقو عنایت کر دیا۔ اس پر سے رام پور کی چھپی ہوئی مہر چھیل دی اور کہنے لگا:

"جناب چُھرا تو حاضر ہے، مگر پیٹ کہاں ہے؟"

جی چاہا اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کر دوں۔ لیکن دوستانہ مراسم کے باعث اتنا صحیح جواب نہیں دے سکا۔ اور چاقو لے کر سیدھا جائے واردات پر پہنچا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں وہ بھکاری موجود نہیں تھا۔ میں نے قریب ہی بیٹھے پُرانے جوتے گانٹھتے ہوئے ایک موچی سے پوچھا، "کیوں جناب! یہ بھکاری صاحب کہاں چلے گئے؟"

وہ جیسے گنگناتے ہوئے بولا:

"مائی ڈیر سر! گان ود دی ونڈ"، یعنی وہ جو بیچتے تھے دوائے دل،
وہ دُکان اپنی بڑھا گئے۔"

میرے مُنھ سے بے اختیار نکلا،

"یار! تم تو گریجویٹ معلوم ہوتے ہو؟"

وہ بولا،۔ "اجی، گریجویٹ نہ ہوتا تو کیا یوں جوتے گانٹھتا؟"

قبر سے واپسی

اور پھر مرنے کے ایک ہفتہ بعد قبر میں میری آنکھ کُھل گئی۔

مگر یہ ہوا کیسے؟ میرا تو باقاعدہ انتقال ہو گیا تھا۔ اگر انتقال نہیں ہوا تھا میری قبر کیسے بن گئی؟ ہو سکتا ہے کہ قبر کسی اور کے لیے کھودی گئی ہو۔ اور موقع پاکر دفن مجھے کر دیا گیا ہو۔ مگر نہیں، سماج ابھی اتنا کرپٹ نہیں ہوا کہ دوسروں کی قبر پر قبضہ کرنے کے لیے خود لاش بن کر لیٹ جائے۔

تو کیا یہ ڈاکٹر کی غلطی تھی؟ مگر ڈاکٹر تو بڑا کوالیفائڈ تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے جتنے زندوں کو قبرستان پہنچایا تھا، ان میں سے ایک بھی زندہ ہو کر نہیں لوٹا تھا۔ میں بڑا پریشان ہوا۔ کس سے تصدیق کرائی جائے کہ میں مر چکا ہوں یا نہیں؟ چنانچہ میں نے قبر میں لیٹے لیٹے آواز دی۔ "کوئی ہے؟"

جواب میں جیسے گنبد کی سی صدا آئی: "کوئی ہے؟"

میں نے پوچھا، "تم کون ہو؟ ڈاکٹر ڈنگا سنگھ ہو؟"

جواب آیا، "نہیں، میں فکر تونسوی ہوں۔"

تھینک گاڈ! میں نے سوچا، اپنی ہی جان پہچان کا بندہ مل گیا۔ یہ میرے ساتھ بلیک میل نہیں کرے گا۔ چنانچہ میں نے پوچھا،

"تم کہاں قبلہ؟"

"میں تمھارے اندر ہوں۔"

"اندر ہو؟ مگر تم تو باہر نکل گئے تھے! انتقال کر گئے تھے! لوٹ کیوں آئے؟"
جواب میں کچھ سسکیاں سی سنائی دیں، جیسے کوئی نادم ہو، بے حد پچھتا رہا ہو، جیسے کوئی بچہ گھر سے جھگڑ کر نکل جائے اور دن بھر بھوکا پیاسا رہنے کے بعد گھر لوٹ آئے اور دیوار سے لگ کر سسکیاں بھرنے لگے۔
میں نے پوچھا۔ "روکیوں رہے ہو فکر تونسوی؟ میں پوچھ رہا ہوں انتقال کے بعد لوٹ کیوں آئے؟"
وہ بولا۔ "دراصل غلط فہمی سی ہو گئی تھی۔ یعنی انتقال میرا نہیں ہوا تھا، تمھارا ہوا تھا۔ میں تو تمھاری روح تھی۔ تمھارے جسم سے نجات پا کر بڑی خوشی ہوئی تھی کہ چلو اس بے ہودہ انسان سے پنڈ چھوٹا۔ اب کسی معقول جسم میں جا کر کچھ دن عیش کروں گی۔ چنانچہ ہفتہ بھر تک مختلف جسموں کے دروازے کھٹ کھٹاتی پھری۔ ایک بادشاہ کے گھر گئی، ایک رئیس کے گھر، ایک نواب کے یہاں، ایک اسمگلر کے در دولت پر ۔۔۔ یہاں تک کہ ایک مٹھ کے مہنت کے یہاں بھی گئی، مگر کسی نے بھی دروازہ نہیں کھولا، سب نے جواب دیا:
"گو بیک! ہم یہ بلا اپنے گلے نہیں منڈھیں گے، جہنّم میں جاؤ۔"
میں ہنس دیا۔ "تو چلی جاتیں جہنّم میں۔"
وہ بھی ہنس دی۔ "آ تو گئی ہوں جہنم میں۔ فکر تونسوی اور جہنم دونوں ایک دوسرے کا ترجمہ ہی تو ہیں۔"
"کتنا غلط ترجمہ ہے!" میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ "کاش! اس جسم کا دروازہ بھی تم پر بند رہتا۔"
"کیسے بند رہتا؟ تم تو اپنے تھے، غیر تھوڑے تھے! چلو نکلو اس قبر سے باہر چلیں۔"
اور میں اپنی، گھسی پٹی روح کے ساتھ قبر سے باہر نکل آیا۔ قبر کی مٹی ابھی کچّی تھی، پختہ نہیں کی گئی تھی۔ شاید میرے رشتہ دار اور مدّاح پختہ قبر کے

لیے بھی چندہ فراہم کرنے میں مصروف ہوں گے۔ جیسے ہی میں نے قبر سے سر باہر نکالا دو آدمی جو شاید میری قبر کی مٹی کھود رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی دم دبا کر بھاگے۔ میں نے پیچھے سے آواز دی، "تم کون ہو بھائیو! میری قبر پر دیا جلانے آئے تھے۔ یا میرا کفن چرانے؟ اور اب دوبارہ بھی آؤ گے یا یہ تمھارا آخری وزٹ تھا؟"

مگر میری آواز پر ان کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی۔ اتنی تیز کہ ان میں سے ایک تو جھاڑی میں اُلجھ گیا، اور جھاڑی سمیت ہی بھاگتا چلا گیا، اور جیسے دل ہی دل میں کہتا گیا "واہ فکر تونسوی! ہمیں تم سے ایسی توقع نہیں تھی، بیکار میں ہمارا قیمتی وقت ضائع کر دیا۔ اتنے وقت میں تو ہم کسی کے کھیت سے گنّے توڑ لیتے یا خدا کی عبادت کر لیتے۔"

مجھے ان کی مایوسی پر واقعی صدمہ ہوا کہ میں زندگی میں تو کسی کے کام نہیں آسکا، مرنے کے بعد بھی کسی کے کام نہ آیا۔ اگر وہ کفن چور تھے تو کم از کم میرا چند گز کفن ہی حاصل کر لیتے اور اگر دیا جلانے والے تھے تو خدا ان کے کچھ گناہ ہی بخش دیتا، میری بدولت انھیں کچھ تو مل جاتا۔ مگر آہ! یہاں بھی انھیں فکر تونسوی کے سوا کچھ نہیں ملا۔

میں نے دیکھا کہ میری قبر کے باہر ایک تختی لگی ہوئی تھی، کچّی قبر کی طرح یہ ایک کچّی سی تختی تھی۔ جس پر کچّی سیاہی سے تحریر تھا:

"یہاں طنز نگار فکر تونسوی ابدی نیند سو رہا ہے۔ وہ مر گیا لیکن اپنی چھوڑی ہوئی حماقتوں کے باعث ہمیشہ لافانی رہے گا۔

تاریخ پیدائش: جس دن قیصر جرمنی مرا تھا۔

تاریخ وفات: جس دن کوئی بھی نہیں مرا سوا فکر تونسوی کے۔"

تختی پڑھ کر مجھے یاد آیا کہ یہ سب فقرے میرے ہی ایک مضمون سے چُرائے گئے ہیں۔ مجھے اپنے مداحوں اور رشتے داروں کے ذہنی افلاس پر بڑا افسوس ہوا کہ وہ میری موت پر دو اوریجنل فقرے بھی نہیں لکھ سکتے تھے تو تختی کے نیچے

کم از کم میرے مضمون کا حوالہ دے دیتے۔

جب میں قبر سے باہر نکلا تو کُھلی فضا اور ٹھنڈی ہوا تھی۔ جس میں قریب کی ربڑ فیکٹری کا کڑوا کسیلا دھواں ملا ہوا تھا۔ یہ فیکٹری ابھی حال ہی میں سیٹھ چھگن لال نے تعمیر کی تھی۔ قبرستان کے قریب اسے فیکٹری کی اجازت کیسے مل گئی؟ یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن اتنا مجھے ضرور معلوم ہوا تھا کہ سیٹھ چھگن لال اب بھی گورنمنٹ کے ساتھ خط وکتابت کر رہا تھا کہ اس قبرستان کو یہاں سے ہٹا کر آبادی سے دور لے جایا جائے اور یہ قبرستان مجھے الاٹ کر دیا جائے تاکہ میں فیکٹری کو پھیلا کر ملک اور قوم کے لیے زیادہ سے زیادہ ربڑ پیدا کر سکوں۔

میں نے سنا تھا کہ لاشیں سڑاند پیدا کرتی ہیں۔ مگر یہاں لاشوں کے بجائے ربڑ سڑاند پیدا کر رہی تھی۔

اپنے کفن کو تہبند کی طرح جسم پر لپیٹے ہوئے میں نے شہر جانے کی ٹھانی. اردگرد کی قبروں میں پڑے ہوئے مُردوں پر حسرت کی ایک نگاہ ڈالی اور ان سے کہا:

اب تو جاتے ہیں مے کدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

شہر کے بڑے گیٹ کے باہر ایک اسٹال پر آج کا اخبار دیکھا، خرید نہیں سکا کیوں کہ پیسے ہی نہیں تھے۔ اخبار میں وہی پُرانی خبریں تھیں۔ گھیراؤ، ہڑتالیں، بھومی چھینو اندولن، کیبرے ڈانس کے اشتہار۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا. اخبار پڑھ کر یوں لگا جیسے باسی روٹی کھا رہا ہوں۔ اچانک ایک اخبار پر نظر گئی جو میرے ایک جیوتشی دوست جناب کھجور انند کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔ لکھا تھا:

"فکر تونسوی کا انتقال ـــــ پیش گوئی سچ نکلی"

مشہور جیوتشی آچاریہ جناب کھجور انند جی نے دو برس پہلے طنز نگار فکر تونسوی

کی موت کی پیش گوئی کی تھی کہ آپ باون سال اور ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اپنے بال بچوں اور قرض خواہوں کو روتا دھوتا چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ یہ پیش گوئی منٹ اور سکنڈ کی حد تک صحیح نکلی۔ لہذا اپنے مستقبل کے حالات جاننے کے لیے جیوتشی کھجورانند کی خدمات حاصل کیجیے۔

اشتہار پڑھ کر میں اُداس ہو گیا۔ میرے زندہ سلامت لوٹ آنے پر بے چارے کھجورانند کے بزنس کو شدید دھکا لگے گا۔ کیا میں دنیا کا بزنس تباہ کرنے کے لیے واپس آیا ہوں؟ میں کھجورانند سے مل کر اسے مشورہ دوں گا کہ تم ایک خنجر اٹھا کر مجھے دوبارہ مار دو۔

میں نے ایک اسکوٹر رکشا والے سے کہا۔ "گل مہر پارک چلو گے؟"

ہمارے دہلی شہر میں یہ رواج تھا کہ اگر اسکوٹر رکشا والے سے چاندنی چوک چلنے کے لیے کہا جائے تو جواب دے گا کہ میں تو انڈیا گیٹ جاؤں گا اور اگر انڈیا گیٹ چلنے کے لیے کہا جائے تو کہے گا کہ شاہدرہ چلنا ہے تو چلوں گا۔

مگر اس اسکوٹر والے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ ٹکٹکی باندھ کر مجھے گھورنے لگا۔ میرے بدن پر سستا سا ریشمی کفن بندھا دیکھ کر بولا:

"آپ کون ہیں، یہ مردے کا کفن کیوں باندھ رکھا ہے؟"

میں نے کہا، "میں فکر تونسوی ہوں۔ یہ کفن میرا اپنا ہے۔ چرایا ہوا نہیں ہے۔"

"فکر تونسوی ہو؟" اسکوٹر ڈرائیور گھبرا کر اپنی سیٹ سے اُچھلا۔ "مگر وہ تو انتقال کر گیا ہے۔ اور تم؟" یہ کہتے کہتے وہ اسکوٹر چھوڑ کر تیزی سے بھاگ گیا۔

شاید وہ مجھے بھوت سمجھ کر بھاگا تھا۔ میری حالت بھی کسی بھوت سے مختلف نہیں تھی بے ہنگم بڑھی ہوئی ڈاڑھی، سر کی بجائے بدن پر کفن، بھوک پیاس سے ہڈیاں باہر اور آنکھیں اندر۔ جسم پر جگہ جگہ مٹی لتھڑی ہوئی اور پاؤں سے ننگا (حیرت ہے کہ دفن کرتے وقت مردے کو جوتا کیوں نہیں پہنایا جاتا؟)

تھکن، بھوک، توہین اور اداسی۔ جو عام ہندستانی کے نصیب میں ہے، میں بھی ان کا مجموعہ بنا ہوا تھا۔ اب میری پوزیشن بے حد عبرت ناک تھی، نہ میں اپنے گھر جا سکتا تھا نہ واپس قبرستان جا سکتا تھا۔ سگریٹ پینے کی خواہش تیزی سے اٹھی مگر جیب میں ایک پیسہ نہیں تھا، بلکہ سرے سے جیب ہی نہیں تھی پہلے اپنے آپ کو فکر تونسوی کہہ کر کسی بھی دکان دار سے سگریٹ ادھار لے سکتا تھا۔ مگر اب، حالاں کہ میں سو فی صدی وہی فکر تونسوی ہوں لیکن مجھے کوئی سگریٹ تک اُدھار نہیں دے گا۔ مرنے کے بعد فکر تونسوی اپنا اعتماد، اپنی ساکھ کھو چکا تھا۔ آہ! صرف سات دن میں فکر تونسوی کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

تھکا ہارا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں قریبی کمیونٹی ہال کی سیڑھیوں پہ جا بیٹھا سیڑھیوں کے اوپر کپڑے کا ایک بڑا سا نیلے رنگ کا ماٹو لگا ہوا تھا۔

طنز نگار فکر تونسوی کی یاد میں ماتمی جلسہ۔

رائٹرز اینڈ جرنلسٹ ایسوسی ایشن کی طرف سے۔

ماٹو پڑھ کر میرے دل میں ہوک سی اٹھی۔ جی چاہا کہ عزّت کے بعد عزّت کا کفن پہنانے والے احباب سے ملوں اور ان کے گلے سے لپٹ لپٹ کر روؤں اور کہوں:

"یارو! میری جدائی میں ٹھنڈی آہیں مت بھرو میں لوٹ آیا ہوں!"

میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا ہال کے اندر داخل ہوا اور احساسِ کمتری کے مارے سب سے پچھلی بنچ پر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ سارے ماحول پر اُداسی اور غم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اسٹیج کے سیاہ پردے کے پیچھے سے ایک ماتمی دُھن بج رہی تھی۔ کتنی لطیف دُھن تھی۔ ماتم میں بھی کتنی گہرائی اور کتنا وقار ہوتا ہے جی چاہا کہ یہ دُھن بجتی رہے، بجتی رہے اور میں مرا رہوں،

مرا رہوں۔

اتنے میں جلسے کا سکریٹری مائک پر آیا۔ میں اسے جانتا تھا۔ اس نے ایک ادبی میگزین میں ایک مرثیہ لکھا تھا: "فکر تونسوی کے طنز کی موت اسی دن واقع ہوگئی تھی، جس دن اس نے طنزیہ مضامین لکھنے شروع کیے تھے۔" اور میں نے یہ فقرہ پڑھ کر کہا تھا: "اگر یہ فقرہ دل کش نہ ہوتا تو میں اس حاسد شخص کے منھ پر طمانچہ لگا دیتا۔" اب سکریٹری نے رُندھے ہوئے گلے سے کہنا شروع کیا: "دوستو! مقامِ تاسف ہے کہ آج ہمارا محبوب و مقبول طنز نگار فکر تونسوی ہماری محفل میں موجود نہیں ہے۔ وہ ہمارے طنزیہ ادب کو سونا کر کے چلا گیا۔"

ماتم گسار احباب نے وفورِ جذبات سے داد کی تالیاں بجائیں۔ ایک تالی میں نے بھی بجائی اور طنزیہ ادب کو سونا کرانے کے غم میں شریک ہوا۔

اگلی نشستوں پر دو صاحب بیٹھے کھُسر پھُسر کرنے لگے۔ ایک نے کہا۔ "حرام زادہ بکواس کر رہا ہے۔ فکر تونسوی سے تو یہ انتہائی نفرت کرتا تھا۔" دوسرا بولا۔ "اور میں نے سنا ہے کہ اس نے مرحوم کی بیوہ کی اولاد کے لیے پانچ ہزار روپے چندہ اکٹھا کیا ہے جس میں آدھا ہڑپ کر گیا ہے۔"

"ہی ہی ہی! کیوں نہ کرتا؟ یہ خود بھی تو ایک بیوہ ہے۔"

اس کے بعد صدرِ جلسہ نے مرحوم فکر تونسوی کی قدِ آدم تصویر کو ایک پھول مالا پہنائی۔ پھول مالا کی خوشبو اور ملائمت مجھے اپنے بدن میں محسوس ہونے لگی۔ بعض اوقات ٹربجڈی بھی کتنی ملائم اور معطر ہوتی ہے! میں جیسے مستی میں لہرا سا گیا۔ صدرِ جلسہ نے پھول مالا پہناتے وقت گلوگیر لہجے میں ایک شعر پڑھا:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

حاضرین میں سے ایک ینگ ٹرک قسم کا ادیب بے اختیار پکار اٹھا: "ہائے! ظالم نے کتنا صحیح شعر کتنے غلط موقع پر پڑھا ہے۔"

میرے ایک انتہائی مدّاح دوست نے اسے گردن سے پکڑا اور کشاں کشاں باہر جاکر پھینک آیا۔

اس کے بعد صدرِ جلسہ نے ماتم گُسار احباب کو تقریریں کرنے کی اجازت دی اور ہر ایک نے ثابت کر دیا کہ صرف وہی فکر تونسوی کو قریب سے جانتا تھا۔ ایک ڈاکٹر صاحب نے کہا مرحوم کو جب بھی کھانسی ہوتی تھی مجھ سے ہی گولیاں لے جاتا تھا۔ اور یہ گولیاں ادبی خدمات کے سلسلے میں دی جاتی تھیں۔ ایک جرنلسٹ دوست نے دعویٰ کیا کہ ایک بار مرحوم نے میرے ساتھ شملے تک کا سفر کیا تھا تو اس نے انھیں راستے میں آلوچے کھلائے تھے۔ ایک پبلشر نے تین بار ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے تین بار اس بات کا ذکر کیا "مرحوم اپنی موت سے کچھ دن پہلے مجھ سے ایک سو روپے ادھار لے گئے تھے اور ان سے اپنی قمیص پتلون سلوائی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ جب مرحوم کا میموریل ہال بنایا جائے تو اس پتلون قمیص کو میری خاص یادگار کے طور پر اس میں ضرور رکھ دیا جائے۔"

میرا جی چاہا کہ اٹھ کر اس پبلشر کا پردہ چاک کر دوں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش بیٹھا رہا کہ مرحوم لوگوں کا اعتبار کون کرتا ہے۔

ایک اور صاحب اٹھے۔ وہ انتہائی گھٹیا شاعر اور انتہائی امیر آدمی تھے۔ وہ بڑے طیش میں تھے میز پر مُکّا مارتے ہوئے گرج کر بولے: میں... میں... میں ساہتیہ اکیڈمی سے پوچھتا ہوں کہ مرحوم کو ادبی ایوارڈ کا مستحق کیوں نہیں سمجھا گیا تھا؟ اور اگر زندگی میں نہیں سمجھا گیا تو کم از کم موت کے بعد ہی انھیں ایوارڈ دے دیا جائے۔"

اس پر شیم شیم، نعرے لگائے گئے۔ نہ جانے فکر تونسوی کو "شیم شیم" کہا گیا یا ساہتیہ اکیڈمی کو؟ بہر کیف غصّے اور جوش کی متفقہ تالیوں کی گونج میں اس تجویز کی تائید کر دی گئی۔

ماتمی میٹنگ کے خاتمے سے چند منٹ پہلے صدرِ جلسہ اٹھ کر چلے گئے، کیوں کہ

انھیں ایک سفارت خانے کی کاک ٹیل پارٹی میں شرکت کرنا تھی۔ مگر جاتے جاتے وہ ماتمی فنڈ میں ایک سو ایک روپیہ چندہ دینے کا اعلان کر گئے، اور باقی ماندہ حضرات نے انسانیت کے بوجھ تلے دب کر جس طرح چندہ ادا کیا اس کے لیے پورے ایک ایکٹ کے ڈرامے کی ضرورت ہے۔

ایک ایکٹ کے اس ڈرامے میں کلائمکس اس وقت پیدا ہوا جب سیاہ ساڑھی میں ملبوس میری بیوہ بیوی کو مائیکرو فون پر آنسو بہانے کے لیے لایا گیا۔ اس نے سہاگ کی آخری چوڑی اسٹیج پر توڑی، ماتھے کا سیندور اور بندی مٹالی، آنکھوں کا کاجل پونچھا اور پھر ان میں آنسو بھر لائی۔ اس ماتمی حالت میں میری بیوی مجھے انتہائی دل کش اور دل رُبا لگی۔ بیواؤں کی شخصیت میں بھی ایک عجیب سی سنی سنی، بھیگی بھیگی جاذبیت ہوتی ہے۔ میں نے جی ہی جی میں کہا: "اے ظالم! تو میرے جیتے جی بیوہ کیوں نہیں بنی تھی؟"

اس کی مسلسل سسکیوں سے محفل کی تمام آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر یہ غم کے نہیں، خوشی کے آنسو تھے، کہ کم از کم میری موت کے بعد تو مجھے بیوی کی محبت ملی، ورنہ اس سے پہلے جب بھی اس کی آنکھوں میں آنسو آتے تھے، اپنی ماں کی یاد میں ہی آتے تھے۔

اور پھر میری بیوی کی خاموش ماتم گُساری سے محفل پر ایسی رقّت طاری ہوئی کہ کسی کے منہ سے کوئی لفظ تک نہیں نکلتا تھا۔ نہ آہ کا نہ واہ کا۔ چنانچہ محفل کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر سکریٹری نے جلسہ کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اور "فکر تونسوی میموریل کمیٹی"، کے پانچ معزز ممبران میری بیوی کی دل جوئی کے لیے قریبی ریسٹوران میں چلے گئے۔ یہ ریسٹوران کافی اور آملیٹ کے لیے بہت مشہور تھا۔ کاش! میں ان سے اتنا کہہ سکتا: "حضرات! میرے نام کے چندے میں سے ایک کافی اور آملیٹ اس بدنصیب کو بھی مل جائے۔

ہال ماتم کرنے والوں سے خالی ہو گیا میں آخری آدمی تھا جو اپنی نشست پر بیٹھا رہا، بیٹھا رہا، بیٹھا رہا ــــ نہ جانے کتنے سال بیٹھا رہا، نہ جانے کتنی صدیاں کہ اچانک کسی نے میرا کندھا جھنجھوڑا اور ایک کرخت سی آواز آئی: "صاحب اٹھیے میٹنگ ختم ہو گئی"۔

اور میری صدیوں کی نیند کھل گئی۔ میرے سامنے کمیونٹی ہال کا چپراسی کھڑا تھا۔ میں نے ہڑبڑا کر پوچھا:

"میں کہاں ہوں؟"

چپراسی ہنس دیا۔ "فکر صاحب! آپ کمیونٹی ہال میں ہیں۔ آپ ملک کے مشہور شاعر جناب گھائل نامرادی کے ماتمی جلسے میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ جلسہ کب کا ختم ہو گیا۔ آپ گھر نہیں جائیں گے کیا؟"

میرا پُنر جنم

اور پھر یوں ہوا کہ میرا پُنر جنم ہو گیا۔ چاروں طرف نظر ڈالنے پر معلوم ہوا کہ میرے ساتھ میری بیوی نے پُنر جنم نہیں لیا۔ معلوم ہوتا تھا، وہ مجھ سے بور ہو چکی تھی اور میرا ابھی یہی خیال ہے کہ بیوی سے ایک جنم کی رفاقت ہی کافی ہوتی ہے۔ بیوی ایک لطیفہ ہے جو دہرانے سے باسی ہو جاتا ہے۔

میں دوبارہ جنم نہیں لینا چاہتا تھا، کیوں کہ میرا یہ پختہ یقین تھا کہ آتما ایک مرغے کی مانند ہے جو ہر جنم میں ککڑوں کوں ہی کرتی ہے۔ اگر کبھی ککڑوں کوں کی بجائے میاؤں میاؤں کرنے لگے تو نیا جنم لینے میں کوئی بُرائی نہیں۔ اس لیے میں چاہتا تھا یا تو میری آتما پرم آتما میں مل جائے۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو مجھے انسان کی بجائے اُلّو بنا دے لیکن پرم آتما نے اپنے اختیارات خصوصی سے کام لے کر مجھے پھر انسانی چولا دے دیا۔

آہ! انسان کو اُلّو بننا بھی نصیب نہیں۔

جس گھر میں پیدا ہوا۔ وہ میرے سابقہ مکان سے تین گز کے فاصلے پر تھا حالاں کہ خدا کی دھرتی اتنی وسیع تھی کہ وہ مجھے کہیں اور پیدا کر سکتا تھا۔ اگر میں اتنا ہی گیا گزرا تھا یعنی ادیب تھا تو مجھے کانگو میں پیدا کر دیتا، جزیرہ سماٹرا میں پیدا کر دیتا، لندن بھی کوئی بُرا نہیں تھا، اس سے ذرا اور اُنٹی رہتی لیکن ہوا

یہ کہ محلّے کی ایک گلی سے میری لاش نکلی اور دوسری گلی سے میری آتما پھر داخل ہو گئی۔ بعض آتمائیں اتنی سست رفتار ہوتی ہیں کہ صرف دو گھروں کا فاصلہ دو جنموں میں طے کرتی ہیں۔

میرے سابقہ والد کا نام کشن داس تھا، موجودہ والد کا نام بشن داس۔ دونوں کسی ایک غزل کے دو قافیے معلوم ہوتے تھے۔ دونوں پڑوسی تھے اور رواج کے مطابق جانی دشمن تھے۔ اور پھر ابھی دونوں کا پُنر جنم بھی نہیں ہوا تھا۔ انسانی رشتوں کی تاریخ میں شاید سب سے پہلی دُرگھٹنا تھی کہ ایک بیٹے کے دو والد تھے، دونوں جائز تھے اور دونوں ابھی زندہ تھے۔

چنانچہ میں چھ برس کا ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں دو کشتیوں میں سوار ہوں۔ مجھے اردگرد کی ہر شے جانی پہچانی لگی۔ وہی در و دیوار، وہی گلی، وہی گلی کے سرے پر گندی نالی کے قریب کھانستا ہوا بابا مکندا، وہی بیوہ رام دلاری کے دھول مٹی میں لوٹتے ہوئے ننگے بچّے، جنھیں میرے دو جنموں کے دوران بھی تن ڈھانکنے کے کپڑے نہیں مل سکے تھے، اور وہی میرا آوارہ بھائی کالو جو سینما کی ٹکٹیں بلیک میں بیچا کرتا تھا اور مجھے کہا کرتا تھا "یو شٹ اَپ! بھگوان جسے بھی پیدا کرتا ہے اسے روزی ضرور دیتا ہے، چاہے کسی ڈھنگ سے دے"۔

شروع شروع میں تو مجھے تعجب ہوتا رہا اور میں خاموش رہا۔ لیکن آہستہ آہستہ گزشتہ جنم کی بہت سی یادیں میرے ذہن کے سمندر میں سے لاشوں کی طرح اُبھر اُبھر کر باہر آنے لگیں اور میں بے چین ہو اُٹھا۔ اور آخر ایک دن اپنے موجودہ والد صاحب سے کہا۔

"جناب! معاف کیجیے، آپ میرے والد نہیں ہیں"۔

والد صاحب مُسکرا دیے۔ ہر والد اپنے بچّے کی معصوم شرارت پر مُسکرا دیتا ہے اور بلند آواز میں میری موجودہ والدہ کو پُکارنے لگے۔

"سُنا تم نے! تمھارا بیٹا کیا فرما رہا ہے۔ ہی ہی ہی!"

میں نے کہا۔ "مگر وہ بھی میری والدہ نہیں ہیں۔"
اس پر والد صاحب گنبھیر ہو گئے۔ ایک ہلکا سا تھپڑ عرض کرتے ہوئے بولے۔
"تو اے ناہنجار! تم کون ہو؟"
"میں فکر تونسوی ہوں۔"
"فکر تونسوی؟" — والد صاحب کو یہ نام کچھ مانوس معلوم ہوا۔ شاید وہ میری تحریروں کا مطالعہ کرتے رہے تھے بڑے یقین سے بولے :
"مگر وہ تو انتقال کر چکا ہے۔"
میں نے کہا۔ "بجا فرمایا۔ مگر اس کا مستقل انتقال نہیں ہوا۔ دراصل اُسے کسی نے قتل کر دیا تھا۔ اور . . . ."
والد صاحب بولے۔ "میں جانتا ہوں۔"
میں نے کہا۔ "ہاں، اور اس کے بعد . . ."
وہ بولے اور اس کے بعد تم سیدھے ہمارے گھر میں آ گئے؟ اور پھر دو سکنڈ سوچنے کے بعد انھوں نے میرا مزید امتحان لینے کی خاطر پوچھا :
"اچھا، تمھارے پہلے والد صاحب کیا کام کرتے تھے؟"
میں نے کہا۔ "ہلدی میں ملاوٹ کرتے تھے۔"
یہ سنتے ہی ان کا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا۔ اور مزید پیلا ہونے کے شوق میں کچھ اور سوال کیے، جن کے میں نے سو فی صدی صحیح جواب دیے، مثلاً رام دھن بجاج کی بیوی برہم کماریوں کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ علاقے کے اسکول کے پرنسپل صاحب گھڑیاں اسمگل کرنے کے جرم میں گرفتار ہو گئے تھے اور مندر کے پروہت درشنانند ایک بھگتنی کو بھگوان کے ڈائرکٹ درشن کرانے کے لیے اغوا کر کے لے گئے تھے۔
اس پر والد صاحب کی حالت غیر ہو گئی۔ اور جب انھوں نے والدہ صاحبہ کو بتایا کہ ہمارے گھر میں جس لڑکے نے جنم لیا ہے، وہ پچھلے جنم میں شاعر اور

ادیب تھا۔ تو والدہ نے سر پیٹ لیا کہ ہائے بھگوان! ہم نے کون سے بُرے کرم کیے تھے کہ ہمارے گھر میں شاعر پیدا ہو گیا۔ مگر میں نے والدہ صاحبہ کو سمجھایا کہ اب میں اس جنم میں شاعر اور ادیب نہیں بنوں گا، بلکہ ایکسپورٹ امپورٹ کا بزنس کروں گا۔ مگر والدہ رُکتے ہوئے بولی۔

"تمھارا صرف جسم بدلا ہے روح تو وہی ہے اور روح اپنا کردار تھوڑے بدلتی ہے۔"

ہوتے ہوتے سارے شہر میں واویلا مچ گیا کہ بشن داس کمیشن ایجنٹ کے گھر جس بچے درشن کمار نے جنم لیا ہے وہ دراصل فکر تونسوی ہے۔ یہ خبر میرے سابقہ والد صاحب کشن داس تک بھی پہنچی تو انھیں بہت رنج ہوا اور ایک دوست سے کہنے لگے۔ "دھکّار ہے ایسے بیٹے پر۔ جب اسے معلوم تھا کہ بشن داس سے ہماری دیرینہ عداوت ہے تو اُس گھر میں کیوں پیدا ہوا؟ وہ بالکل ناخلف ثابت ہوا بعض بیٹے زندگی میں ناخلف ہوتے ہیں، مگر یہ مرنے کے بعد ناخلف نکلا۔

اور پھر یہ سُن کر مجھے بڑا افسوس ہوا کہ وہ آواگون کی تھیوری کے ہی خلاف ہو گئے ہیں اور کہتے پھرتے ہیں، وہ میرا بیٹا ہی نہیں ہے، نہ جانے کون ہے حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ پہلے آواگون کے زبردست حمایتی تھے اور کہا کرتے تھے، "بیٹا! تمھاری ماں پچھلے جنم میں بھینس تھی۔ ایک بار میں نے اس بھینس کو ڈنڈا مارا تو اس نے دھمکی دی تھی کہ میں اس کا بدلہ لوں گی۔ چنانچہ اب وہ میری بیوی بن کر پچھلے جنم کے ڈنڈے کا بدلہ لے رہی ہے۔"

میرے درشن کے لیے غول کے غول ہمارے گھر آنے لگے۔ آنے والوں میں میری محبوبہ بھی تھی جو پہلے میرے ہجر میں روتی تھی اب وصال پر رونے لگی کیوں کہ اب مجھ پر عشق کی بجائے بچپن سوار تھا اور میں بھی اپنے سابقہ والد صاحب کی نظر بچا کر اپنی بیوی کو دیکھ آیا اور اس کی بیوگی پر چوری چھپے روتا رہا۔ کیوں کہ یہ ایک عجیب بے ڈھنگی صورت حال تھی کہ ایک عورت کا خاوند زندہ تھا، مگر سماج اُسے

بیوہ کیے جا رہا تھا۔
اخباروں نے ایک شرارت یہ کی کہ میرے سابقہ اور موجودہ جسم دونوں کے فوٹو ساتھ ساتھ شائع کیے اور اس طرح اپنے گاہکوں کو احمقانہ مسرت عطا کی۔ دوسری طرف آواگون کے حمایتیوں اور مخالفوں میں خانہ جنگی کی خبریں آنے لگیں اور ان میں سے کئی زخمی ہو کر ہسپتال میں بھی پہنچ گئے۔ میرے پچھلے جنم کے احباب مجھ سے ملاقات کے لیے تشریف لائے اور ٹھنڈی آہ بھر کر بولے،
"فکر تونسوی! تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"
میں نے کہا۔ "مجھے پُنر جنم ہو گیا ہے۔ خدا تم سب کو پُنر جنم عطا کرے!"
محلّے کی رام دیئی مجھ سے ملنے کے لیے آئی۔ مجھے دیوتا سمجھ کر چرن چھوتے ہوئے بولی۔
"بیٹا تم بھگوان سے مل کر آئے ہو۔ اُدھر تم نے میرے بیٹے دولت رام کو تو نہیں دیکھا۔"
میں دولت رام کو جانتا تھا۔ اس کے نصیب میں دولت کم اور زخم زیادہ لکھے تھے۔ وہ شاعر رواج کے مطابق بھوکا ننگا تھا۔ وہ گھٹیا، سستی ٹھرّا شراب پیتا تھا اور پیتے پیتے بھگوان کو پیارا ہو گیا تھا۔ میں نے کہا:
"لیکن ماں جی! زخمی صاحب . . . . تو اِدھر کہیں دکھائی نہیں دیے۔ ممکن ہے میری طرح پُنر جنم لے چکے ہوں۔"
وہ بولی۔ "لیکن کہاں — بیٹا! اس کی تو کوئی سُدھ خبر ہی نہیں۔"
میں نے دانش مندوں کی طرح جواب دیا:
"ہو سکتا ہے وہ اسی محلّے میں پیدا ہو چکے ہوں، لیکن ماں جی! نیا جنم تو کرموں کے مطابق ملتا ہے۔"
وہ بولی۔ "کرم تو اس کے اتنے اچھے تھے بیٹا! کہ وزیر بن سکتا تھا۔"
"پھر وہ نرک میں گیا ہوگا ماں جی۔" میں نے کہا۔

رام دیئی مجھے گالیاں دیتی ہوئی چلی گئی۔

میری موجودہ والدہ صاحبہ بجا فرماتی تھیں کہ میرا جسم بدلا تھا۔ روح وہی تھی، وہی کھرا پن، وہی بے لاگ لپٹ گفتگو، یعنی وہی راست بازانہ حماقتیں۔ اب لوگ میری باتیں سُن کر خوش نہیں ہوتے تھے، نالاں ہو جاتے تھے۔ دھیرے دھیرے انھوں نے ہمارے گھر آنا جانا بند کر دیا۔ محلے کے معززین نے اپنے بچّوں کو میرے ساتھ کھیلنے کودنے سے منع کر دیا۔ عورتوں نے میری ماں سے، مردوں نے میرے باپ سے بول چال بند کر دی اور اب ماں باپ مجھے سانپ کا بچّہ سمجھ کر پالنے لگے۔

امید و یاس کے ماحول میں، میں بہت اُداس ہو گیا۔ راتوں کو تنہائی میں زار و قطار رو دیا کرتا کہ اے خالقِ کل! میری یادیں مجھ سے چھین لے۔ پچھلے جنم کا ہر عطیہ واپس لے لے۔ لیکن خالق کو شاید یہ منظور نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ زندگی میرے لیے دو بھر ہوتی گئی۔ خالق نے مجھے نیا جنم ضرور دیا تھا، نئی عقل نہیں دی تھی۔ اس لیے دنیا خواہ مخواہ مجھ سے خوف کھانے لگی، مجھ سے دور بھاگنے لگی، اور میں چھ برس کا ننھا سا لڑکا اتنی وسیع، عریض دنیا میں تنہا ہو گیا اور اپنی زندگی صرف اپنے ساتھ گزارنے لگا۔

لیکن اچانک ایک دن تنہائی کا یہ حلقہ ٹوٹ گیا۔

دراصل اخباروں میں برابر مطالبہ ہونے کہ فکر تونسوی کو جس آدمی نے قتل کیا تھا ابھی تک گرفتار نہیں ہو سکا۔ اس لیے کیوں نہ اب فکر تونسوی سے ہی قاتل کا نام پوچھ لیا جائے۔ قانون اگر نالائق ہے تو پُنر جنم سے کیوں نہ فائدہ اُٹھایا جائے۔

اس مطالبے پر شہر بھر میں میرا مُردہ پھر زندہ ہو گیا۔ ایک ہجوم نے غصّے میں آکر تھانے کو آگ لگا دی۔ آخر تنگ آکر سرکار نے ایک پولیس آفیسر میرے پاس بھیج دیا اور وہ بولا۔ "صاحب!"

میں نے کہا۔ "وہ فوت ہو چکا ہے۔"

وہ بولا۔ "آہ! اس کی موت ہی تو ہماری مصیبت بن گئی۔ آپ ہی ہمیں اس مصیبت سے چھٹکارا دلائیے اور بتائیے کہ آپ کو کس نے قتل کیا؟"

میں نے کہا۔ "ایک اسکوٹر ڈرائیور نے۔"

"وجہ؟"

"بہت معمولی۔ اس نے مقررہ کرایے سے بیس پیسے زیادہ طلب کیے تھے، میں نے اسے شرم دلائی۔ جس پر اُس کا پارہ چڑھ گیا اور اُس نے چھُرا نکال کر میرے پیٹ میں بھونک دیا۔"

پولیس افسر بولا۔ "صرف بیس پیسے کے لیے؟ اتنے بڑے ادیب کو صرف بیس پیسے کی خاطر مار ڈالا۔"

"جی ہاں! اُن دنوں بیس پیسوں میں ایک سنگترہ آجاتا تھا مگر ادیب لوگ پانچ پانچ پیسے میں مل جاتے تھے۔ ریٹ کا فرق تھا ناجی!"

پولیس افسر کو طیش آگیا، بولا۔

"ہم اُسے پھانسی پر لٹکا دیں گے، آپ اس کا نام بتائیے، اسکوٹر کا نمبر بتائیے۔"

مجھے اُس کا حلیہ اور اسکوٹر نمبر پوری طرح یاد تھا۔ لیکن...... لیکن... کیا یہ اُسے پھانسی دیں گے؟ میرا ننھا سا جسم کانپ اُٹھا۔ یوں لگا جیسے پھانسی کا پھندا ڈرائیور کی بجائے میری طرف بڑھ رہا ہے۔ نہیں نہیں، میں اُس کا حُلیہ نہیں بتاؤں گا۔ مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے ــ اور میں سچ مچ بھاگ کھڑا ہوا۔ زور زور سے بھاگتا گیا۔ بھاگتا گیا۔ گلی، سڑک، بازار اور پھر میں پیچھا کرنے والوں کی نظر بچا کر ایک تنگ و تاریک گلی میں گھُس گیا۔ اور پھر یوں محسوس ہوا جیسے اُس اندھیرے میں ایک چہرہ اُبھرا ہے۔ یہ چہرہ بھیانک تھا۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔

اُس کے ہاتھ میں ایک چمکیلا چھُرا تھا۔ اور میں نے اُسے پہچان لیا۔ یہ وہی تھا، بالکل وہی، وہی اسکوٹر ڈرائیور۔

اور اُس نے میرے پیٹ میں چھُرا گھونپ کر ایک بار پھر مجھے قتل کر دیا۔

کروڑپتی بن جاؤ گے

"تم جلدی کروڑپتی بن جاؤ گے۔"

۱۹۳۸ء میں آج سے ۲۵ برس پہلے میں نے یہ فقرہ ایک مشہور جنتری میں پڑھا تھا۔ جنتری کا نام "پرسدھ گھمنڈی جنتری" تھا جسے ملک کے مشہور و معروف جیوتشی پنڈت گھمنڈی دیال جی شائع کرتے تھے اور صرف اس لیے شائع کرتے تھے کہ ان کے والد صاحب قبلہ پنڈت پاکھنڈی دیال جی بھی ہر سال جنتری ہی شائع کرتے تھے۔

اور انھیں پنڈت گھمنڈی دیال جی نے ۱۹۳۸ء کی پرسدھ گھمنڈی جنتری میں میری قسمت کا حال لکھتے ہوئے پیش گوئی کی تھی کہ "تم جلد ہی کروڑپتی بن جاؤ گے۔" چنانچہ پورے پچیس سال تک میں نے کروڑپتی بننے کا انتظار کیا لیکن میری بجائے جب سوسائٹی کے دوسرے رذیل اور ادنیٰ صفت آدمی کروڑپتی بنتے گئے تو میں طیش میں آ گیا اور فیصلہ کیا کہ گھمنڈی لال کے علم جیوتش کے خلاف ایک زبردست مضمون لکھ ڈالوں۔

اور اس مضمون کے سلسلے میں مجھے ۱۹۳۸ء کی تلاش میں شہر کے مشہور کباڑی بازار میں چلا گیا۔ ہمارے شہر کے اس کباڑی بازار کی منفرد خصوصیت یہ ہے کہ یہاں قدیم سے قدیم اشیا بھی بالکل نئی حالت میں مل جاتی ہیں اور پھر یہاں کے کباڑیوں کے پاس دنیا کی ہر نایاب اور نادر چیز موجود رہتی ہے مثلاً ایک دوست نے مجھ پر یہ عجیب و غریب انکشاف کیا تھا کہ جاپان سے انھوں نے ایک تخت خریدا

تھا جس پر سکندرِ اعظم بیٹھا کرتا تھا لیکن بالکل ویسا تخت ہندستان کے لیے کباڑی بازار میں بھی اسے دکھایا گیا۔ جس پر سکندر بیٹھ کر حکومت کرتا تھا۔

غرض یہ کباڑی بازار نوادرات دنیا سے بھرا پڑا تھا۔ یہاں وہ ترکش بھی موجود تھا، جس سے ارجن نے مہا بھارت کی جنگ لڑی تھی، وہ کوزہ بھی تھا جس سے محمد بن قاسم پانی پیا کرتا تھا، وہ بہی کھاتہ بھی تھا جس میں ہیمو بقال اپنی فوج کا حساب کتاب لکھا کرتا تھا۔ اس کباڑی بازار میں ایسی انسانی کھوپڑی بھی دستیاب ہو جاتی تھی جسے ایک کباڑی بکرماجیت کی کھوپڑی کہہ کر بیچتا تھا اور دوسرا کباڑی اسے علاء الدین خلجی کی کھوپڑی کے طور پر فروخت کرتا تھا۔

اس کباڑی بازار کے متعلق ایک لطیفہ بہت مشہور تھا کہ ایک بار ایک بوڑھا آدمی ایک کباڑی کی دکان پر پہنچا اور بولا "کیا آپ کے پاس مہاراجا رنجیت سنگھ کی کھوپڑی موجود ہے"۔ کباڑی نے بڑے کاروباری تفخر کے ساتھ کہا "کیوں نہیں۔ ابھی حاضر کرتا ہوں"۔ چنانچہ اندر جا کر وہ ایک کھوپڑی اٹھا لایا۔ بوڑھے نے کھوپڑی کو غور سے دیکھ کر کہا "معاف کیجیے میں نے خود مہاراجہ رنجیت سنگھ کو دیکھا تھا۔ ان کا سر تو بہت بڑا تھا مگر یہ تو چھوٹا سا سر ہے"۔ کباڑی نے جھٹ جواب دیا۔ "جناب یہ اُن کے بچپن کی کھوپڑی ہے"۔

چنانچہ ایسے عالم گیر قسم کے کباڑی بازار میں کوئی وجہ نہیں تھی کہ مجھے پچیس سال پہلے کی پرسدھ گھمنڈی جنتری دست یاب نہ ہوتی۔

اس کباڑی بازار کی دکانیں چوبی کھوکھوں کی بنی ہوئی تھیں۔ شکستہ اور میلے کچیلے کھوکھوں کی یہ قطار دور سے یوں دکھائی دیتی تھی جیسے کسی یتیم خانے میں یتیموں کی فہرست لٹکی ہوئی ہو۔

میں نے یہ فہرست ساری کی ساری دیکھ ڈالی، مگر جنتری نہ ملنا تھی نہ ملی۔ کباڑی بازار کی آخری دکان سے جب میں مایوس ہو کر لوٹ رہا تھا تو کباڑیے نے میرا کندھا پکڑ کر کہا "جناب اگر جنتری نہیں ملی تو نہ سہی کچھ اور لے جائیے۔

مگر میری دکان سے خالی ہاتھ مت لوٹیے۔ میرے ہاں جنتری سے زیادہ نادر چیزیں موجود ہیں۔"

"مثلاً.... ؟" میں نے جل بھن کر کہا

"مثلاً.... " کباڑیے نے ایک ٹوٹے پھوٹے گراموفون پر رکھا ہوا ایک میلا کچیلا پیتل کا چراغ دکھاتے ہوئے کہا۔ یہ چراغ لے جائیے۔ یہ ایک تاریخی چراغ ہے۔ شہنشاہ اکبر اس کی روشنی میں بیٹھ کر مطالعہ کیا کرتے تھے۔

کچھ ہنستے ہوئے اور کچھ روتے ہوئے میں نے عرض کیا۔ "مگر جناب معاف کیجیے، شہنشاہ اکبر تو ان پڑھ تھے۔"

"تو پھر یہ اکبر نہیں ہوگا شاہ جہاں ہوگا" کباڑیے نے کاروباری وقار کی خاطر اپنی غلطی کی فوراً تصحیح کر ڈالی۔

اگرچہ جنتری کی بجائے چراغ لے جانے میں کوئی تک نہیں تھا لیکن نہ جانے کیوں چراغ مجھے پسند آ گیا۔ جیسے انسان کو کچھ چیزیں خواہ مخواہ پسند آجاتی ہیں جیسے شادی سے پہلے ایک لڑکی مجھے خواہ مخواہ پسند آگئی تھی۔ جو بعد میں میری بیوی بن گئی اور عمر بھر کے پچھتاوے کا باعث بنی۔

میں نے اس کباڑیے سے اس چراغ کی قیمت پوچھی اور اس نے شاید یہ سمجھ کر کہ میں کوئی ریسرچ اسکالر ہوں، "مغل سیاست میں چراغوں کا رول" پر ایک تھیسس لکھ رہا ہوں۔ چراغ کی قیمت پچاس روپے بتا دی۔ لیکن جب اکبر بادشاہ سے نیچے اتر کر شاہ جہاں سے بھی نیچے گرتی پڑتی آخر مغل بادشاہ تک چراغ کی بات پہنچی تو قیمت گر کر پچاس روپے سے پچاس پیسے تک آ پہنچی اور سودا طے ہو گیا۔

میری بیوی نے چراغ کا استقبال بڑی سرد مہری سے کیا۔ بالکل ایسے جیسے وہ ہر شام میرا استقبال کیا کرتی تھی۔ چراغ دیکھ کر اس نے طعنہ دیا کہ تمھارا انتخاب ہمیشہ غلط ہوتا ہے۔ تم زندگی میں کبھی کوئی صحیح چیز گھر نہیں لائے۔

میں نے کہا، "میں تمھیں گھر لایا ہوں، ہندستان کی کروڑوں عورتوں میں سے منتخب کر کے، کیا میرا یہ انتخاب غلط تھا؟"

بیوی کے لیے اس کی تردید مشکل تھی۔ (اگرچہ ناممکن نہیں تھی)

اور پھر اس نے اس چراغ میں ایک عجیب خوبی ڈھونڈھ نکالی کہ الیکٹرک سپلائی کمپنی کی نالائقی کی وجہ سے جب کبھی بجلی فیل ہو جائے گی تو اس بحران میں یہ چراغ بڑا سود مند رہے گا۔

اس خوبی کو دریافت کرنے کی دیر تھی کہ بیوی کو ایک دم جیسے چراغ سے محبت ہو گئی اس نے اعلان کیا کہ میں اسے ابھی مانجھ کر شیشے کی طرح چمکا دیتی ہوں۔ میری بیوی کو سگھڑاپے کا مرض لاحق ہے۔ بلکہ اس کے میکے والے دنیا بھر میں پروپیگنڈہ کرتے پھرتے تھے کہ ہم نے ایک سگھڑ بیٹی ایک نالائق آدمی سے بیاہ دی ورنہ اس نالائق خاوند کا گھر آج تک نیلام ہو چکا تھا۔ (اور یہ بات پروپیگنڈہ کے باوجود صحیح تھی)

مگر جوں ہی بیوی نے آنگن میں جا کر اُپلوں کی راکھ سے شہنشاہ اکبر کے اس چراغ کو رگڑنا شروع کیا، اچانک ایک دہشت ناک سا دھماکہ ہوا، اور آنگن کی زمین پھٹی۔ زمین سے دھوئیں کا ایک طوفان اٹھا، اور اس دھویں میں سے تقریباً پندرہ فٹ لمبا، ساڑھے سات فٹ چوڑا ایک خوف ناک مگر مہیب صورت دیو نمودار ہوا۔ اور گرج کر بولا۔

"اے الٰہ دین! میں تیرا غلام ہوں! بتا! میرے لیے کیا حکم ہے؟"

میں اس وقت برآمدہ میں ایک آئینہ کے سامنے کھڑا اپنی داڑھی کے چند تازہ تازہ سفید بال گن رہا تھا۔ دھماکے اور دھویں سے گھبرا کر میں اپنی اکلوتی بیوی کی طرف دوڑا، جو اس وقت تک دو تین گز دور جا پڑی تھی۔ اور کراہ رہی تھی۔ اور دیو اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ سچ مانیے تو اتنے بڑے گھناؤنے دیو کو دیکھ کر میرے اپنے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ لیکن اس خیال سے کہ بیاہ

کے وقت میں نے ساتھ پھیرے لیے تھے، اور ہر پھیرے میں بیوی کی حفاظت کا عہد کیا تھا۔۔۔ لپک کر بیوی کو اٹھایا اور بیوی کی آنکھ بچا کر دیو سے کہا۔

"تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟"

دیو بدستور ہاتھ جوڑے ہوئے گرج کر بولا۔

"میں الہ دین چراغ کا دیو ہوں اور یہ عورت الہ دین ہے اور میں اس کا غلام ہوں۔"

"معاف کیجیے، یہ تو شیلا ہے الہ دین نہیں ہے۔ الہ دین کمہار کا گھر اگلے چوک پر ہے۔ آپ غلطی سے الہ دین کے بجائے شیلا کے گھر آگئے ہیں۔"

دیو نے میری تشریح کو کلیتاً رد کرتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جانتا جس انسان کے پاس یہ چراغ ہو گا وہ الہ دین ہو گا۔ اس لیے یہ عورت بھی الہ دین ہے۔ اس نے مجھے بلا لیا ہے۔ اور یہ مجھے جو حکم دے گی میں اس کی تعمیل کروں گا۔"

حکم دینے والے الہ دین کی گھگھی بندھ چکی تھی اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا، اور وہ مارے خوف کے مجھ سے یوں چمٹ گئی تھی جیسے کسی فلمی پوسٹر میں کوئی محبوبہ اپنے عاشق سے چمٹی ہوئی ہو۔ مجھے فوری خطرہ یہ لاحق ہو رہا تھا کہ کہیں میرے بچوں کی اس واحد ماں کا ہارٹ فیل نہ ہو جائے۔ کیوں کہ وہ گزشتہ پانچ برس سے ضعف قلب کا شکار تھی اور ڈاکٹر کا آخری بل ادا کیے ہوئے ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے۔

بیوی کے ہارٹ فیل ہونے کے احساس سے میرا اپنا ہارٹ دھڑکنے لگا کہ میری بیوی کے بیوہ ہونے میں صرف ایک آدھ منٹ کی کسر باقی ہے۔ مگر نہ جانے میری بیوی کے کون سے اچھے کرموں کا پھل تھا کہ میں نے اپنے آپ کو فوراً سنبھال لیا اور کہا

"جاؤ تمھیں حکم دیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر شانتی پرکاش گولڈ میڈلسٹ کو

بلا لاؤ۔"
مگر دیو ٹس سے مس نہ ہوا۔ جما کھڑا رہا۔
"جاؤ۔ جاتے کیوں نہیں اے غلام نمک حرام!"
نمک حرام نے دھمکی دی۔
"جس کے پاس چراغ ہے میں صرف اسی کا حکم مانوں گا۔ تم کون ہوتے ہو حکم دینے والے؟"
دیو کی سماجی کم شعوری پر مجھے سخت افسوس ہوا۔ اس کم بخت کو اتنا بھی معلوم نہیں، کہ تم جس کے غلام ہو وہ خود میری غلام ہے۔ جب وہ میرا حکم مان لیتی ہے تو تم کیوں نہیں مانتے۔ لیکن صورتِ حالات چوں کہ انتہائی نازک تھی اور سوشل رشتوں پر بحث ومباحثہ سے میرا اور بیوی کا رشتہ ٹوٹ جانے کا خطرہ تھا اس لیے میں نے فوراً بیوی کے ہاتھ سے چراغ چھین کر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا
"اب میں الہ دین ہوں۔ چراغ میرے پاس ہے۔"
مگر دیو شاید کچھ بااصول واقع ہوا تھا بڑے باوقار لہجہ میں بولا۔
"پہلا حکم پہلے الہ دین کا۔ دوسرے الہ دین کا حکم بعد میں۔۔۔۔"
مجبور ہو کر میں الہ دین نمبر ایک کے تلوے ملنے لگا اور کہا۔
"جانِ من! ہوش میں آجاؤ۔ خدا کے لیے کوئی حکم دے دو۔ کوئی سا بھی حکم، کوئی انٹ شنٹ اوٹ پٹانگ سا حکم۔"
اور میری بیوی میں نہ جانے کیسے ایکا ایکی ہمت پیدا ہوگئی اور نہ جانے اس نے مجھ سے کہا یا دیو سے کہا
"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"
اور پھر ایک دم زمین شق ہوئی اور دیو دفع ہوگیا
کچھ دن تک ہم میاں بیوی حواس باختہ رہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا

تھا کہ ہمارے ساتھ یہ کیا سلوک روا رکھا گیا ہے کہ ہم اپنی خالص اور ستھری محنت کی کمائی کے عادی تھے۔ مگر ہمیں حرام کی کمائی دی ہے۔ اور چراغ عنایت کر دیا گیا تھا۔ اس لیے ہمارے حواس کا مختل ہو جانا قدرتی تھا کیوں کہ اس سے ہماری عادات و خصائل میں بڑی گڑبڑ کا اندیشہ ہو گیا تھا۔ ہم اپنی نارمل زندگی میں اس امر کے عادی ہو چکے تھے کہ نئی جرابیں نہ خریدی جا سکیں تو پھٹی ہوئی جرابیں پہننے میں بھی ایک لطف آتا ہے۔ ہم تو اپنے بچوں تک کو یہ سکھا چکے تھے کہ باپ کی پرانی پتلون سے خالی بنیان بنانا ہندستانی کلچر ہے اور ہمیں اپنے کلچر کی ہر قیمت پر حفاظت کرنی چاہیے۔

اس لیے جب الہ دین کے چراغ کے تصور سے ہمیں یہ احساس ہوا کہ ہم ایک منٹ میں امیر کبیر بن سکتے ہیں۔ تو ہمارے کلچر کو ایک اچانک صدمہ ہوا اور ہم اپنے ہوش اس حد تک گنوا بیٹھے، کہ پورا ہفتہ ایک دوسرے سے کھل کر بات بھی نہ کر سکے۔

سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس چراغ کو کہاں رکھا جائے۔ تاکہ نہ یہ بچوں کے ہاتھ لگے اور نہ اسے چور اٹھا کر لے جائیں۔ اس معاملے میں چور اور بچے، دونوں کو ہم نے ایک سطح پر رکھا اور اسے زمین کے اس حصے میں دبا دیا جہاں بیوی کے طلائی زیورات کا ڈبہ دبا ہوا تھا۔ ایک قباحت تھی کہ ممکن ہے چراغ نکالنے کی کئی بار ضرورت پڑے اس لیے اس کو ٹرنک میں رکھا جائے جہاں پتاجی کی وصیت اور بیوی کے جہیز کی کچھ باقی ماندہ نشانیاں اور عریاں میگزین کے خفیہ فوٹو رکھے ہوئے ہیں۔ بڑی مشکل سے بیوی اس بات پر رضامند ہوئی کہ ٹرنک کی دو چار چابیاں رکھی جائیں۔ ایک میرے پاس رہے اور ایک میری بیوی کے پاس۔

یہ پہلا واقعہ تھا کہ میرے اور بیوی کے اعتماد کی دیوار میں دراڑ پڑ گئی، ورنہ اس سے پہلے ہم دونوں شاستروں کی ہدایات کے مطابق ایک دوسرے پر جان

چھڑکتے تھے ۔ مجھے پہلی بار شبہ ہوا کہ شاستر اور بیوی دونوں ناپائیدار ہیں اور اس چراغ کے ساتھ شاستر کا سورج نہیں جل سکتا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے بیوی سے زیادہ چابی پر یقین آیا۔

چند دن اور بے معنی طور پر گزر گئے۔

ایک دن میں (چوری چھپے) الہ دین چراغ کا مشہور قصہ میرز ڈنگا رام بک سیلرز کے ہاں سے خرید کر رات بھر پڑھتا رہا۔

دوسرے دن جب شام کو گھر لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں بیوی بھی الہ دین کا قصہ کتاب دوپٹے کے پلو میں چھپائے پڑھ رہی ہے۔

میں نے کہا

"کیا پڑھ رہی ہو جانِ من!"

"بھجنوں کی ایک کتاب ہے۔ ایشور بھگتی کے بڑے بڑے سندر گیت لکھے ہیں اس میں۔"

میں نے مردانہ جرأت سے کام لے کر کتاب چھین لی۔

"یہ تو الہ دین کا قصہ ہے جناب!"

میں نے طنزاً عرض کیا

ظاہر ہے بیوی مشتعل ہو گئی۔ بالکل ایسے ہی جیسے سبزی میں نمک زیادہ پڑ جائے تو اس کا الزام کول ڈپو والے پر لگا دیتی ہے کہ وہ گیلا ایندھن مہیا کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے بھڑک کر کہا۔

"میں جانتی ہوں تمھیں اب مجھ سے محبت نہیں رہی، بلکہ اب تو اس نگوڑی کالی کلوٹی چھوکری کے پیچھے گھومتے ہو۔ میں پوچھتی ہوں وہ کیوں آتی ہے ہمارے گھر؟ اب کے آئی تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔"

میں نے کہا

"دیکھو میری محبوبہ اور الہ دین کے درمیان محبت کو مت لاؤ۔ محبت

ایک مقدس عظیم جذبہ ہے اور میری محبوبہ چھوکری کا رنگ کالا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ محبت نہیں کر سکتی۔ باقی رہا ٹانگیں توڑنے کا معاملہ تو میں اپنی محبوبہ کی ٹانگوں کا تحفظ اب زیادہ معقول طریقے سے کر سکتا ہوں۔ کیوں کہ میرے پاس دیو موجود ہے۔"

یہ ایک ایسی کھلی دھمکی تھی جو بہت کم خاوند بہت کم بیویوں کو دے سکتے ہیں۔ عام حالات میں شاید میں یہ کہنے کی جرأت کبھی نہ کرتا۔ بلکہ اس کالی کلوٹی چھوکری سے بدستور خاموش اور محفوظ محبت کیے جاتا کہ محبت کی یہ دھڑکن ہمارے اپنے کانوں کو بھی سنائی نہ دیتی۔ لیکن جب سے الہ دین کا چراغ میرے قبضے میں آیا تھا میرے اندر ایک حیرت انگیز تبدیلی آرہی تھی۔ گزشتہ آٹھ دس نسلوں سے جتنی نجابت، شرافت اور بزدلی میرے ورثے میں آئی تھی وہ میری گرفت سے نکلتی جارہی تھی اور اس کی بجائے وہ وحشیانہ قوت اور جارحانہ بربریت میرے اندر داخل ہورہی تھی جو انسان کو مچھر، گیدڑ اور گدھا وغیرہ سمجھتی ہے اور اس طرح وہ تاریخی حالات پیدا کر دیتی ہے۔ جب ایک انسان دوسرے انسان کا اور ایک قوم دوسری قوم کا خون پی کر مورخین کے لیے مواد مہیا کرتی ہے۔

"میں چراغ کے اس دیو سے جو چاہے کروا سکتا ہوں۔" میں دن بھر حسین ترین خواب دیکھتا۔ "میں اگر چاہوں تو آگرہ کے تاج محل کو اکھڑوا کر اپنے کوچہ گھاسی رام میں نصب کروا سکتا ہوں، میں اگر چاہوں تو پورے دہلی شہر کو یہاں سے جزیرہ انڈیمان میں منتقل کروا سکتا ہوں۔ میرے ہاتھ میں جادو ہے، طلسم ہے، طاقت ہے، دولت ہے۔ میں عظیم ہوں، میں بلند ہوں، میں شہنشاہ ہوں۔ میرے قدموں پہ ساری دنیا جھک سکتی ہے (اس ہندستانی بیوی کی کیا بساط ہے؟)

میری بیوی بھجنوں کی پُستک یعنی "قصہ الہ دین چراغ کا" میرے منھ پہ پٹخ کر اندر چلی گئی۔ معلوم ہوتا تھا اس کے اندر بھی وہی شہنشاہ جاگ چکا تھا جو

میرے اندر جاگ رہا تھا۔ اس میں بھی وہی وحشیانہ قوت اور جارحانہ بربریت جنم لے چکی تھی جو میرے اندر۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہی بیوی کتنی نرم دل، وفادار اور محکوم ذہنیت کی مالک ہوا کرتی تھی لیکن اب یقیناً اسے بھی یہ احساس ہو چکا ہے کہ الہ دین کا چراغ اس کے پاس ہے۔ اس لیے اس دیو کے مقابلے پر میرے اس خاوند ایسے آدمی کی کیا ہستی ہے۔ میں تو دیو سے کہہ کر اسے بحرِ ہند میں ڈبو سکتی ہوں۔

چنانچہ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ اندر جاتے ہی وہ پلنگ پر جا گری اور منہ چھپا کر مظلوم بیویوں کی طرح بسورنے لگی۔ مگر میں انتہائی طیش میں تھا۔ متاثر نہ ہو سکا، ورنہ مظلوم بیویوں کا رونا ہمیشہ رومانٹک لگتا ہے۔ میں نے تیزی سے ٹرنک کے تالے کی چابی گھمائی اور چراغ نکال لیا۔

میرا پروگرام صریحاً یہی تھا کہ دیو کو بلاتے ہی اسے پہلا حکم یہ دوں گا کہ میری بیوی کو اٹھا کر ماؤنٹ ایورسٹ پر پھینک آؤ (اور واپسی پر میری کالی کلوٹی محبوبہ کو لیتے آنا)

میں نے جلدی جلدی فرش پر چراغ رگڑا۔ میں غصے میں اپنے آپ کو پاگل بھی محسوس کر رہا تھا، اور انتہائی دانش مند بھی۔ کیوں کہ جس بیوی پر سے اعتماد اٹھ جائے اسے اپنے گھر میں رکھنا انتہائی پاگل پن تھا۔

چراغ رگڑا گیا۔

کچھ بھی نمودار نہ ہوا۔

نہ دھواں، نہ دیو، نہ دھماکہ۔

صرف فرش پر ایک ہلکی سی رگڑ کا نشان پڑ گیا۔

شاید چراغ کے رگڑنے میں کوئی ٹیکنیکل نقص رہ گیا ہو۔ میں نے سوچا اس لیے دوسری بار میں نے اسے پوری جواں مردی سے رگڑا، یہ ایک ایسی زوردار رگڑ تھی۔ جیسے کوئی بڑھئی آرے سے لکڑی چیر رہا ہو۔

مگر دیو اس بار بھی نمودار نہ ہوا۔

یہ دیو کو کیا ہوگیا؟
کم بخت کہیں دوسری جگہ مصروف نہ ہو۔
کہیں ہسپتال میں بیمار نہ پڑا ہو۔
کہیں مجھ سے ناراض نہ ہوگیا ہے۔
مگر الہ دین کے قصے والا دیو کبھی بیمار نہ ہوتا تھا۔ خاصی اچھی ہیلتھ تھی اس کی۔ شاید وہ اصلی دیو ہوگا۔ اور میرے چراغ والا دیو اس کا ہندستانی ایڈیشن ہوگا۔

قریب قریب مایوس ہو کر میں نے چراغ کو فرش پر دے مارا کہ وہ ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔ لیکن میرے اس غلام دیو کا جو تاج محل کو اٹھا کر کوچہ گھاسی رام میں نصب کر سکتا تھا۔ دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔

میں نے بیوی سے کہا
"دیو کیوں نہیں آتا؟"
اس نے جل بھن کر جواب دیا۔
میں کیا جانوں، تمھاری اس کالی کلوٹی چھوکری سے عشق کرنے میں مصروف ہوگا؟"
یہ طعنہ عین میرے کلیجے میں لگا۔
میرے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔
آج کا دن مجھ پہ عدم اعتماد کا دن تھا۔ پہلے بیوی پر اعتماد ٹوٹا، اب دیو پر۔ دونوں میں اخلاق و کردار کی کمی دردناک تھی۔ اب کوئی کس پر اعتماد کرے۔ سچ ہے اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں۔ سب اکیلے ہیں۔ کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا نہ دکھ میں نہ سکھ میں۔ ہر دکھ تنہا ہے، ہر سکھ اکیلا ہے۔
درد اور بیراگ کی اس کیفیت میں میری عجیب حالت ہوگئی صاف ثابت ہو رہا تھا کہ یہ دنیا صرف مایہ ہے بلکہ سرمایہ ہے۔

سرمایہ دار، مردہ باد!

انقلاب، زندہ باد!

دنیا بھر کے دکھی لوگو! تنہا ہو جاؤ، اکیلے ہو جاؤ، ایک دوسرے سے الگ ہو جاؤ!

دنیا بھر کی بیویو! اپنے خاوندوں کے ساتھ وفا کا فراڈ چھوڑ دو۔ اور اے الہ دین کے چراغ! میری آنکھوں سے دور ہو جا، نہیں تو اپنی آنکھیں پھوڑ لوں گا۔

میں رونے لگا۔

بیوی پہلے ہی رو رہی تھی۔

لیکن ہم دونوں الگ الگ وجہ سے رو رہے تھے۔

بچے ہمیں روتا دیکھ کر دوڑے آئے اور وہ بھی رونے لگے ان کے رونے کی وجہ ہم دونوں سے الگ تھی۔

("ماڈرن الہ دین" میں سے)

میں نا اہل نکلا

دراصل پہاڑی جھُبّ کی دکان سے میدان کی طرف روانہ ہونے سے پہلے والد صاحب نے ڈکلیر کیا تھا۔ "نارائینے بیٹا! تم بزنس کے نا اہل ہو۔"
لیکن یہ ڈیکلریشن بھی انھوں نے اِسی لہجہ میں کیا تھا جیسے معذرت طلب کر رہے ہوں۔ کسی والد کو اتنا مرنجان مرنج نہیں ہونا چاہیے کہ وہ بیٹے کی نااہلیت پر دو چار گالیاں بھی نہ نکال سکے۔ اور میری پوری زندگی کا یہی المیہ ہے کہ ورثے میں مجھے والد صاحب کے بہی کھاتے ملے۔ گالیاں دینے کا آرٹ نہیں ملا۔ گالیاں دے سکتے تو بہی کھاتوں کی رقم ڈوب نہ جاتی۔

حالاں کہ بڑے ہو کر میں نے دیکھا۔ گالیوں کا ایک موثر رول بھی ہوتا ہے۔ گالیاں کھا کر تو کئی لوگ گدّیاں تک چھوڑ جاتے ہیں۔ میں ایک سبزی فروش کو جانتا ہوں اس نے چند سال پہلے اپنے بڑے بھائی کو گالیاں دی تھیں (گالیاں فحش اور کاری تھیں) تو بڑا بھائی اپنا مکان چھوڑ کر جنگلوں کی طرف بھاگ گیا تھا۔ شاید اسے شیر وغیرہ کھا گئے ہوں گے۔ اور گالیاں دینے والا بھائی آج کل محلہ سُدھار کمیٹی کا پریذیڈنٹ بنا ہوا ہے۔

اور میں — ؟ نہ جانے مجھے کتنی انجمنوں اور سنستھاؤں کا پریذیڈنٹ بنایا گیا۔ مگر فوراً ہی یہ عہدہ مجھ سے چھین لیا گیا۔ کیوں کہ میں ہمیشہ عہدے دار بننے کے نا اہل قرار دیا گیا۔ اور یہی میری زندگی کا المیہ ہے کہ والد صاحب کے ورثے میں مجھے نہ گالیاں ملیں نہ اہلیت۔

ایک تو والد صاحب کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں کوہِ سلیمان کی ان پہاڑیوں کی کھلی رومانٹک فضا مجھے کسی بلوچی دوشیزہ کے عشق کا روگ نہ لگا دے۔ کیوں کہ میں نے پہاڑی جھرنوں اور رسیلے بیلوؤں کے پیڑوں کے نیچے بیٹھ کر غزلوں کے شعر لکھنا شروع کر دیے تھے۔ بلکہ دو تین قطعے تو میں نے عبداللہ ساربان کی بیٹی عائشاں کے ہجر میں بھی قلم بند کیے تھے۔

اور والد صاحب نے کاغذ پر لکھے ہوئے یہ قطعے نہ جانے کیسے دیکھ لیے تھے۔ اور کہا تھا۔ "اوں ہوں! نارائینے بیٹا! یہ ہجر و وصال ہمارا کام نہیں ہے۔ ہم تو ترازو میں نون تیل بیچنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔"

کوئی انسان کس مقصد سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ میرے کچے ذہن میں ابھی واضح نہیں تھا۔ میں بھی اپنے کچے پن میں والد صاحب کے سامنے نادم ہو گیا۔ مگر نہ جانے کیسے میرے منھ سے نکل گیا۔ "باپو! یہ میری غلطی ہو گئی۔" لیکن میں نے نہ جانے ایسے کیوں محسوس کیا کہ عائشاں کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ میرے اسی جذبے نے مجھ سے یہ شعر لکھوا دیے۔ آپ کا حکم ہے، تو میں انھیں چاک کر دوں گا۔

مگر والد صاحب کا بیان تھا کہ جذبوں کا ترازو سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا اور عاشق کے ساتھ بھاگ جانا عائشاں کی غلطی تھی یا نہیں۔ یہ بلوچ قبائل کی اپنی پرابلم ہے۔ اس غلطی کا اعلان کرنا نہ شاعروں کا فرض ہے نہ تاجروں کو دلچسپی ہے۔ اور والد صاحب بالکل صحیح فرماتے تھے۔ جذبے آج بھی ترازو میں نہیں تولے جاتے کیوں کہ جذبات کا کوئی مارکیٹ ریٹ نہیں ہوتا۔ عائشاں عشق کرنے نہیں گئی تھی بلکہ دوسری بار سیاہ ہونے گئی تھی۔ اس کا انجام کسی غیرت مند بلوچ کا خنجر تھا۔ یہ خنجر اس نارائینے کے سینے میں بھی گھپ سکتا تھا۔ جو جذباتی ہو گیا تھا اور جھرنے کے کنارے شعر لکھنے بیٹھ گیا تھا۔

مجھے پہاڑی جھُپ کی دکان سے واپس میدان کی طرف بھیجتے وقت والد صاحب کے ذہن میں یہی خدشہ تھا۔ کوئی باپ اپنے بیٹے کو خنجر تلے نہیں دیکھ

سکتا۔ بلوچ دوشیزہ جو اپنے سینے میں جذبوں کے درد محسوس کر سکتی ہے، وہ خنجر پروار بھی کر سکتی ہے۔ بلوچ قبائل کا عشق ترازو کے پلڑوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ترازو تو بے ضرر چیز ہے صرف تاجر کی سمجھ میں آسکتا ہے، سادہ لوح بلوچ کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ کہ کنواری بھیڑ کی اون کے وزن پر سرسوں کا تیل کیوں ملتا ہے۔ اور اسی سادہ لوحی کے باعث ترازو کو خنجر سے کوئی خطرہ کیوں لاحق نہیں ہو سکتا۔

والد صاحب یہ سب کچھ جانتے تھے، مگر میں نہیں جانتا تھا کیوں کہ میں اُلّو تھا، جذباتی تھا۔ پہاڑی جھرنوں، چرواہے کی بلندیوں اور اونچی کھلی فضاؤں میں گنگناتی ہوئی پہاڑیوں کا عاشق تھا۔ لہٰذا والد صاحب نے مجھے نا اہل ڈیکلیر کر دیا۔

حکیم کی حکمت عملی

والد صاحب کو دوسرا خطرہ تھا — میری بے وقوفی اور نورن شاہ کی عقل مندی سے۔ نورن شاہ بلکہ نور شاہ جی بلوچ قبائل کے اہل سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ اگر وہ سید نہ ہوتے تو انھیں صرف نورن کہا جاتا نورن شاہ نہیں اور نورن شاہ جی تو بالکل نہ کہا جاتا۔ تاریخ میں صرف خاندان کا احترام کیا جاتا ہے، افراد کا نہیں۔

ان کے احترام کا ایک اور سبب حکمت یعنی طب تھی۔ سادہ لوح بلوچ ان کے پاؤں کی مٹی کو مقدس سمجھ کر ہمیشہ اپنی پیشانی سے لگالیا کرتے کیوں کہ ان کا عقیدہ تھا کہ ہر انسان کے پاؤں چاہے ایک سائز اور ایک شباہت کے ہوں۔ اور پہاڑ کی مٹی بھی چاہے ہر جگہ ایک ہی رنگ اور خوشبو دیتی ہو۔ لیکن بعض پاؤں ایک مخصوص کوالٹی کے ہوتے ہیں۔ ان پاؤں کے نیچے جو مٹی آجائے۔ اس مٹی کا سٹیٹس بڑھ جاتا ہے۔ اس کی خوشبو بدل جاتی ہے۔ اس میں ایک ایسا تقدس آجاتا ہے جو آپ کی پیشانی تک پہنچ جائے تو ستارے کی طرح جگمگا اٹھتا ہے۔

نورن شاہ جی کے پاؤں اسی مخصوص کوالٹی کے تھے۔ مٹی کی کوالٹی کیسے بدل سکتی ہے؟ اس سوال پر ایک شبہ کئی مرتبہ میرے ذہن میں رینگا لیکن میں

اس وقت کسی حتمی فیصلے پر نہیں پہنچ پاتا تھا۔ کیوں کہ راستے میں عقیدے کی دیوار حائل تھی۔ اگرچہ بڑے ہو کر جب میں ہزاروں میل دور آگے نکل گیا تو مجھے کتابوں نے بتایا کہ مٹی کی یہ کوالٹی پاؤں سے نہیں بدلتی۔ چاند اور منگل سیارے پر چاہے امریکن خلاباز پہنچ جائیں، چاہے روسی۔ چاند اور مٹی کی کوالٹی وہی رہتی ہے جو ازل سے چلی آرہی ہے۔

نورن شاہ جی کے پاؤں کی مٹی میں پاکیزگی یوں بھی شاید آجاتی ہو۔ کہ وہ تھوڑا بہت پڑھ لکھ بھی لیتے تھے، جب کہ بلوچ قبائل پڑھنے لکھنے سے محروم تھے۔ پڑھے لکھوں نے ہمیشہ ان پڑھوں پر راج کیا ہے۔ ان سے اپنا احترام کرایا ہے۔ آج تک کراتے ہیں، آج تک مقدس کہلاتے ہیں۔

میرے والد صاحب اور نورن شاہ جی ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے دوستی کا ایک کاز تھا۔ جو مشترکہ تھا۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہیں لکھا ہے۔ کہ نورن شاہ علم طب میں کچھ شُدبُد رکھتے تھے۔ چاروں طرف ماحول پر ان پڑھتا طاری ہو۔ تو ممکن ہے انھیں اپنے لقمان حکیم ہونے کا شبہ بھی ہوتا ہو۔ بہر کیف وہ اندھوں میں کانے تھے، اس لیے راجا کہلاتے تھے۔ بلوچ مرد وزن کبھی کبھی بیمار ضرور ہوتے تھے۔ کیوں کہ بیماری خدا کا عطیہ ہوتی ہے، انسان جب بھی خطرے کے تقاضوں سے ٹکرائے گا۔ وہ نورن شاہ جی کے پاس بھاگا بھاگا ضرور جائے گا۔

"شاہ جی! شاہ جی! میری بیٹی کے گلے سے لہو آتا ہے۔ خدا کے لیے بتائیے، میں کیا کروں؟"

اور نورن شاہ جی کاغذ کے ایک پرزے پر نسخہ لکھ دیتے۔ اور حکم دیتے۔

"یہ پرزہ لے کر دھنا سیٹھ کے پاس چلے جاؤ۔ ان سے دوائیاں لے کر بیٹی کو پلاؤ، انشاء اللہ شفا ہوگی۔" ہاں، نورن شاہ جی اور والد صاحب کی دوستی کی ایک بنیاد یہ پرزے تھے جنھیں سادہ لوح قبائلی بلوچ قرآن کی آیت سمجھ کر لے جاتے۔ اور جیسا کہ فن تجارت میں رواج ہے۔ ایک روپے کی دوائی آٹھ روپے میں خریدی

جاتی اور پڑھے لکھے افراد اس لوٹ میں برابر کے حصے دار بن جاتے۔ نورن شاہ جی طب کو حکمت کہتے تھے۔ اور اس لوٹ کو حکمت عملی۔

میں یہ کہہ کر (خاکم بدہن) قبلہ والدصاحب کی بدخوئی نہیں کر رہا۔ والدصاحب نہایت شریف اور مرنجان مرنج انسان تھے۔ لیکن ماحول؟ ماحول ان کی شرافت کو آہستہ آہستہ پچھوڑ رہا تھا۔ اور تجارت؟ — تجارت کے جس راستے پر وہ پاپی پیٹ کے مارے گامزن تھے۔ اس راستے پر شرافت کے کشتوں کے کئی پشتے لگ جاتے ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ اگر پہاڑی قبائل میں انھیں بزنس ہی کر کے ہم بال بچوں کی پرورش و پرداخت کرنی ہے۔ تو انھیں نورن شاہ جی کو مقدس ماننا ہی پڑے گا ان کا شیئر ہولڈر بننا ہی پڑے گا ان کی لوٹ کو اپنی زندگی کا مقصد بنانا ہی پڑے گا یہ ان کی مجبوری تھی۔ اور ۔۔۔۔۔

۔۔۔ اور تاریخ شاہد ہے۔ کہ ظلم کرنا، ظالموں کی مجبوری بن جاتی ہے اور مظلوم اس ظلم کو مقدس مٹی سمجھ کر ماتھے پر لگا لیتے ہیں۔ آج بھی اپنے گردوپیش پر نگاہ ڈالیے۔ کیا مٹی ایک دم کسی پاؤں سے چھوتے ہی مقدس نہیں بن جاتی اور مقدس بنتے ہی یہ اعلان نہیں کر دیتی۔ کہ اس پاؤں کا بینک بیلنس دو کروڑ سولہ لاکھ چھتر ہزار روپے ہے۔

والدصاحب اور نورن شاہ جی اس حکمت عملی کو اس حد تک سمجھ گئے تھے کہ ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔ کیوں کہ دونوں عالم وفاضل سمجھے جاتے تھے، دونوں پڑھے لکھے۔ ہزاروں ان پڑھ بلوچوں میں صرف دو۔

گائے مقدس، بزنس جھوٹ

لیکن حادثہ یہ ہوا۔ کہ ایک تیسرا پڑھا لکھا بھی اس ماحول میں پہنچ گیا تھا — جو بڑا ہو کر فکر تونسوی کہلایا۔

اور ضمنی حادثہ یہ ہوا کہ غوثے بلوچ کی حاملہ بیوی زلیخاں جب اپنے کھیت میں درانتی سے جوار کی فصل کاٹنے میں مصروف تھی۔ کہ اُس کی کوکھ کی فصل ایک اچانک جھٹکے سے پک گئی۔ اسے دردِ زہ شروع ہوا۔ قرب وجوار میں سوائے

ایک دو بکریوں کے اس کا کوئی پرسانِ حال تھا نہ چشم دید گواہ۔ کڑے کلیجے والی زلیخاں بلوچن نے ایک منٹ ادھر ادھر دیکھا۔ اور پھر ازل سے عطا کی ہوئی نسائی شرم کو بالائے طاق رکھ دیا۔ کوکڑ بیر کے ایک درخت تلے لیٹ گئی۔ سنگین چٹان ایسے پٹھوں کے زور پر اس نے ایک بیر بہوٹی ایسے بچے کو جنم دیا۔ نہ گھبرائی نہ شرمائی نہ بھاگی۔ اور پھر درانتی سے ناف کی نال کو یوں کاٹ دیا جیسے جوار کے خوشے کو کاٹتی رہی تھی اور پھر اپنی میلی کچیلی چھیل میں بچے کو لپیٹ کر ایک پتھر کے سائے میں لٹا دیا۔ اور فوراً بعد پھر جوار کی فصل کاٹنے میں مصروف ہو گئی۔

آج پچاس برس بعد جب بھی مجھے وہ حادثہ یاد آجاتا ہے جسے بلوچ قبائل بالکل ضمنی سا حادثہ کہا کرتے تھے۔ تو فرطِ احترام سے میرا سر جھک جاتا ہے بلوچ عورتوں کی پامردی مجھے اس مٹی سے کہیں زیادہ مقدس لگتی ہے، جو نورن شاہ جی کے پاؤں سے اٹھائی جاتی تھی۔ آج جب کہ بیداری نسواں کے غلغلے مچائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹری تحقیقاتوں کے انبار اور سمینار لگائے جاتے ہیں یہاں تک کہ عورتوں کے سال منائے جاتے ہیں تاکہ ان میں عورتوں کی عظمت اجاگر کی جائے تو میں کہتا ہوں۔ وہ ان پڑھ، بلوچ قبائل کی معمولی سی خاتون زلیخاں ان سب سے عظیم تھی، جس نے بغیر کسی میڈیکل ریسرچ، کسی ہسپتال اور کسی انجکشن کے ایک بیر بہوٹی بچے کو گولڑ بیر کے درخت کے نیچے جنم دے دیا اور فوراً بعد جوار کے خوشے کاٹنے میں مصروف ہو گئی تھی۔ زچہ عورتوں کا چالیسا تک نہیں کاٹا تھا۔

زلیخاں عظیم تھی۔ لیکن نورن شاہ تو عظیم نہیں تھا۔ حالاں کہ وہ پڑھا لکھا تھا۔

دوسرے دن مجھے میدان کی طرف واپس روانہ ہونا تھا۔ صبح ہی صبح غوثے خاں بلوچ سراسیمہ، پریشان حال، ہماری جھُپ دُکان پر نمودار ہوا۔ چھ فٹ لمبے تڑنگے جوان کی آنکھوں میں کانپتے لرزتے آنسو مجھے انتہائی غیر موزوں لگے۔ ایک پرزہ میرے والد صاحب کی طرف بڑھا کر بولا۔ دھنا سیٹھ! خدا کے

لیے مجھ پر رحم کرو۔ یہ دوائی نورن شاہ جی نے لکھ کر دی ہے۔ میری زلیخاں نے کل جس بچے کو جنم دیا تھا۔ وہ بے ہوش پڑا ہے۔ نہ جانے کس بدروح نے اس پر نظر ڈال دی ہے۔"

والد صاحب نے حقے کا ایک لمبا کش پہلے لیا۔ پرزہ بعد میں پڑھا۔ حکمت عملی کا تقاضا تھا۔ کہ بچے کی بے ہوشی کو حقے کے کش پر ترجیح نہ دی جائے۔

"ہوں! مگر غوث خاں! دوائی تو شاہ جی نے تیر بہدف لکھی ہے۔ لیکن ہے بہت مہنگی۔"

"میں اپنی بکری تک بیچ دوں گا سیٹھ! لیکن میرا بچہ بچ جائے۔"

"اللہ اور شاہ جی کے فضل سے بچ تو جائے گا لیکن ....."

والد صاحب نے حقے کا ایک اور کش لگایا۔ اس کش میں پوری بکری جیسے بکھر گئی۔ اڑ گئی۔

"لیکن ..... لیکن ..... کیا سیٹھ جی! میرا بچہ مر رہا ہے، جلدی کرو۔"

اور غوثے نے بلوچی روایت کے مطابق ایک سوکھی لکڑی والد صاحب کے کندھے پر رکھ دی۔ جس کا مطلب ہوتا ہے۔ اللہ کے سادہ بندے سے ہیرا پھیری مت کرنا۔

لیکن غوثے! یہ بیش قیمت دوائی اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ میدان سے منگانی پڑے گی۔ کسی خاص آدمی کو گھوڑے پر بھیجنا پڑے گا۔

"کوئی پروا نہیں گھوڑا بھیج دو سیٹھ! میں دوسری بکری بھی کھول کر تمھیں دے دوں گا۔"

والد صاحب نے حقے کا ایک اور کش لیا۔ ہر کش کے ساتھ ایک بکری بڑھ رہی تھی۔ اور پھر پرزے کو ایک بار پڑھنے کے بعد بولے "غوثے! اللہ کو مانتے ہو۔"

"ہوں۔"

"تو اللہ کی قسم! دو بکریوں سے کام نہیں بنے گا۔ یہ دوائی بے حد نایاب

ہے اور پھر گھوڑ اسوار کے آنے جانے کا خرچہ ۔ تمھاری ایک پوری گائے کھل جائے گی"۔ غوثے کے آنسوؤں کی جیسے پوری تابندگی مر گئی۔ اس نے والد صاحب کی طرف یوں دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔" سیٹھ! دروغ بیانی کر رہے ہو"۔
اور جیسے والد صاحب نے بے زبان کی زبان سمجھ لی۔ اور بولے "یقین نہیں آتا۔ تو نورن شاہ جی سے پوچھ لو۔ وہ خداوند تعالیٰ کا سیدزادہ تو جھوٹ نہیں بولے گا نا؟"
اور میں نے دیکھا۔ کہ غوث خاں والد صاحب کے قدموں پہ گر پڑا۔ ان کے پاؤں کی مٹی کو نورن شاہ کے قدموں کی مٹی سمجھ کر آنکھوں سے لگا لیا اور تڑپتے ہوئے لہجے میں کہا "میں گائے کھول دوں گا۔ تم گھوڑا بھیج کر دوائی منگالو"۔
"کل شام کو آ کر لے جانا۔ اللہ سب کا بھلا کرے۔ سب کے بچوں کو زندگی عطا کرے۔ آمین!" والد صاحب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔

غوث خاں بلوچ کے جانے کے بعد میں نے وہ پرزہ والد صاحب سے لے کر پڑھا۔ اس پر تحریر تھا "ست گلوئے دو تولے" دوائی کی قیمت پچاسی روپے۔ دستخط نورن شاہ!"
والد صاحب نے بتایا۔ کہ ان دنوں ایک دودھیلی گائے پچاسی روپے میں آتی ہے۔
"مگر باپو" میں نے عرض کیا" ست گلو کے دو تولے تو ہم پانچ روپے میں میدان سے خرید لائے تھے اور وہ اس وقت بھی ہماری دکان میں موجود ہے۔"
موجود نہیں ہے بیٹا! تم سمجھو، یہ شاہ جی کا فرمان ہے۔ ہم اگر ان کی نافرماں برداری کریں گے تو ان بلوچی قبائل میں اپنا بزنس نہیں کر سکتے۔ شاہ جی کسی اور دکان دار کو میدان سے بلا لیں گے۔ سکّہ ان کا چلتا ہے، ہمارا نہیں"۔

"گویا ہم شاہ جی کے ایجنٹ ہیں۔"

"چپ! کوئی سن لے گا تو۔۔۔۔"

"مگر باپو! غوثے کا نومولود بچہ بے ہوش پڑا ہے۔ وہ رات کو کہیں مر گیا تو۔۔؟"

"نہیں مرے گا۔ شاہ جی بڑے دانا ہیں۔ سب اونچ نیچ جانتے ہیں۔ تم چپ رہو۔"

میں چپ ہو گیا، سو گیا۔ رات کی گہری پرچھائیاں ہر غوثے، ہر زچہ اور ہر بچہ پر موت کی تاریکی بن کر چھا گئیں۔ لیکن میرے اندر کا شاعر نہ سو سکا۔ یہ جھوٹ ہے، اختراع ہے، دغا بازی ہے، بے رحمی ہے، استحصال ہے، غریب بلوچ کا استحصال۔ اس کی ان پڑھتا اور بے بسی کا استحصال ــــ اور جب میں بڑا ہوا تو مجھے پورے سماج میں اس استحصال کی تاریکیاں نظر آئیں۔ استحصال کا مفہوم معلوم ہوا۔ کس طرح اسی استحصال کی بدولت انسان لوٹے جاتے ہیں۔ قومیں لوٹی جاتی ہیں۔ تاریخ کے سبھی صفحات جو کالے ہو چکے ہیں۔ اسی استحصال کی سیاہی سے ہوئے ہیں۔

میں رات بھر بے چینی سے کروٹیں لیتا رہا۔

میں رات بھر غوثے کے نومولود بچے کو پچاسی روپے میں تولتا رہا۔ اور ہر بار پچاسی روپے کا وزن بڑھ جاتا۔ کیوں کہ نومولود سانس لیتا تھا، پچاسی روپے سانس نہیں لیتے تھے۔

کسی روح کا سانس ــــ پچاسی روپے کے بے روح وجود سے ان گنت گنا اعلیٰ تھا۔ کیوں کہ نومولود کو خدا نے پیدا کیا تھا۔ جبکہ پچاسی روپوں کو انسان نے پیدا کیا تھا۔

او خدا! مجھے نیند کیوں نہیں آرہی ہے۔

انسان کے نومولود بچے کا اکھڑتا ہوا سانس میری نیند میں کیوں خلل ڈال رہا ہے؟

اگر نیند نہ آئی تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔

اچانک ایک خیال، برقی لہر کی طرح میرے رگ و ریشے میں دوڑ گیا اور کہہ گیا "تمھاری نیند دو تولے ست گلو کے سینے میں بند ہے۔ وہی تمھاری نیند کا دم گھوٹ رہی ہے لہٰذا اٹھو! اٹھو!"

قارئین کرام! میں یہاں اپنی بلند اخلاقی کا پروپیگنڈہ نہیں کر رہا۔ کیوں کہ اُن دنوں فلسفۂ اخلاق کے متعلق میری معلومات انتہائی ناقص تھیں۔ جیسے ایک معصوم لڑکے کی ہو سکتی ہیں۔ لیکن اتنا مجھے یاد ہے کہ میں بے اختیار اٹھا، چاروں طرف تاریکی مسلّط تھی، خاموشی اور بے نیازی، کسی کے بھی درد و کرب سے بے نیاز فضا میں سانس تک نہیں لے رہی تھی۔ چوروں کی طرح دبے پاؤں میں نے اپنے جھب کا تالا کھولا۔ اپنے مال کی آپ چوری کرنے کے خیال سے اندر داخل ہوا۔ ماچس کی ایک تیلی، کائنات کی بھی آنکھوں سے چھپا کر جلائی اور دوسرے لمحے میں دو تولہ ست گلو میرے ہاتھ میں تھی۔ اور میں غوثے خاں بلوچ کے جھب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چاروں طرف کی اتھاہ تاریکی میں دو تولے ست گلو کا چراغ جلائے ہوئے۔

"غوثے! غوثے" میرے منھ سے نہ جانے کس پُراسرار حکم کی تعمیل میں نکل گیا۔

"آؤ چھوٹے سیٹھ! کیا بات ہے۔ تمھیں کس نے بھیجا۔ کیوں بھیجا۔ آپ کے سیٹھ باپ تو خیر سے ہیں نا؟" — غوثے نے جیسے سراسیمہ ہو کر کہا۔ وہ اپنے نومولود کو جھولی میں لیے تھپ تھپا رہا تھا۔ اس کی زچہ بیوی کی آنکھوں میں بھی نیند نہیں تھی۔ میری طرح ان کی نیند بھی نہ جانے کس نے اُڑا دی تھی۔

میں نے آہستہ سے کہا "ہش کسی سے کہنا نہیں — بڑے سیٹھ سے بھی نہیں، نورن شاہ سے بھی نہیں، کسی بھی ذی روح سے نہیں۔ ابھی ابھی اللہ کا ایک فرشتہ سا میرے ہاتھ میں دوائی کی یہ پڑیا دے گیا۔ اور کہہ گیا۔ غوثے سے جا کر کہو، یہ پُڑیا نومولود بچے کو شہد میں ملا کر چٹا دے۔ انشاء اللہ شفا ہو گی۔"

اور اس سے پہلے کہ غوثے مجھ سے اس فرشتے کے خدوخال پوچھتا۔ میں تیزی سے لوٹ آیا، آتے ہی سو گیا۔ مجھے نیند آگئی۔ قارئین کرام! میں کیا جانتا تھا کہ اس دنیا میں نیند صرف دو تولے ست گلو میں بند رہتی ہے۔

اس کے بعد ایسی شیریں نیند کو میں زندگی بھر ترستا رہا ہوں۔

اور صبح کا ثواب

دوسری صبح کو غوثے بھاگتا ہوا، خوش و خرم ہماری دکان پر آیا۔ اور والد صاحب سے کہنے لگا "سیٹھ صاحب! مبارک ہو۔ میرا بچہ بالکل ٹھیک ہو گیا۔ مسکرا رہا ہے۔"

"کیسے؟" والد صاحب حیرت زدہ ہو گئے۔

"نہیں جانتا کیسے؟ اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا۔ غریبوں کا اللہ ہی ہوتا ہے آپ دوائی لینے کے لیے میدان میں گھڑ سوار کو مت بھیجیے۔" اور والد صاحب نے میری طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ جیسے وہ کہہ رہی تھیں "برخوردار تم دکان داری کے نااہل ہو۔ تمھیں واپس میدان کی طرف ہی کوچ کرنا ہوگا۔"

(فکرؔ کی آپ بیتی "میں" کا ایک اقتباس)

متوالا

میرا وہ پہلا اندازہ غلط ثابت ہوا، جو میں نے پہلی مرتبہ مخمور جالندھری کو دیکھ کر لگایا تھا۔ اور جب اس نے تھیلے سے ہمارا جا شراب کی ایک بوتل نکال کر اپنے "مخمور" ہونے کا عام فہم ثبوت دیا تھا۔

اور جب میں آخری مرتبہ مخمور جالندھری سے مل کر آیا تو میرے سامنے پورے کا پورا مخمور جالندھری اپنی بالکل مختلف شکل میں نمایا تھا۔ وہ اپنے دوہرے جسم، متوسط قد اور مست چال کے ساتھ تو وہ ہر آدمی کو نظر آجاتا ہے لیکن اب کے میرے سامنے وہ اپنے پورے کردار کے ساتھ موجود تھا۔ اُف! کتنا پیارا اور محبوب شخص تھا وہ؟

بادی النظر میں اسے دیکھ کر پیار یا حسن یا رومانس کا کوئی تصور اور مناسبت پیدا نہیں ہوتی۔ بھلا ایسے بھاری بھرکم وجود کو پیار کے نرم و نازک سانچے میں کیوں کر ڈھالا جا سکتا ہے۔ یا حسن کا کوئی لطیف پردہ اس ڈیل ڈول کو کیسے چھپا سکتا ہے اور میری طرح مخمور کے قریب جانے والے ہر آدمی کو تعجب ہوگا جب وہ دیکھے گا کہ یہ شخص محبت کے لطیف سیال میں اپنے وجود کو تو کیا، ساری کائنات کو تحلیل کر سکتا ہے۔

محبت اس کی بنیادی کمزوری ہے۔ جس پر وہ اپنی زندگی کی خطرناک عمارت ابھارتا جا رہا ہے۔ اگرچہ یہی خطرناک عمارت ایسے خوبصورت نقوش اور متوازن زاویوں کے ساتھ استوار ہو چکی ہے کہ کوئی بھی آدمی اس پر خراشیں

ڈالنے کی جرأت تو کیا تصور بھی نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی بھی نہیں جو اس کی توانا جمالیت کو داغ دار کرنے کی خواہش سے مجبور ہو کر ایسی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر مخمور جالندھری کا دل ڈوب جاتا ہے اور غم کی ان گہری چوٹوں کو چھپانے کے لیے وہ اپنا سمندر جیسا کلیجہ آگے کر دیتا ہے اور پھر اس احساس سے کہ کہیں اُس کے اِس غم چھپانے کے عمل کا راز بھی کسی پر نہ کھل جائے۔ وہ یا تو زور زور سے بولنے لگتا ہے یا بالکل خاموش ہو جاتا ہے۔ اور پھر شراب خانہ کا رخ کرتا ہے اور پھر شراب کے دو چار پیگ پی کر نظمیں سناتا ہے۔ اپنے مول تول والے عشق کے قصے بیان کرتا ہے۔ چار آنے ریٹ والی طوائف سے لے کر ڈارون، ہیگل اور کانٹ تک کے فلسفے پر بحث کرتا ہے اور یوں اپنے غم کو چھپانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ جب صبح ملتا ہے، تو اس کی پیشانی پر غم کی ایک لکیر بھی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ اُمنگ نمایاں ہوتی ہے کہ آج وہ ایک نئی نظم لکھے گا۔ کسی انگریزی آرٹیکل کا ترجمہ کرے گا۔ بسا اوقات تو وہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ رات اُس نے شراب خانے میں اپنا غم چھپانے کے لیے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے تھے۔ وہ کہتا ہے۔ ''تم جھوٹ بولتے ہو۔ یہ کبھی ہو نہیں سکتا کہ میں اتنی سی بات کے لیے غم خریدوں، اور پھر اسے دور کرنے کے لیے اتنا بڑا ابکھیڑا کھڑا کر دوں۔ یہ تو میری فطرت کے خلاف ہے—''

بس! سارا بکھیڑا یہیں سے شروع ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو سارے زاویوں سے نہیں دیکھ سکا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو سمجھ ہی نہیں سکا۔ بلکہ وہ اپنی فطرت کے بعض عناصر کو ننگا ضرور دیکھ لیتا ہے۔ لیکن یہ ننگا پن کبھی تو حد سے تجاوز کر جاتا ہے اور کبھی ننانوے فی صدی ڈھنپا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اپنے اس دونوں طرح کے ننگے پن کو دیکھنے میں اس کی ذہانت ہمیشہ ساتھ رہتی ہے اور دیکھنے کے معیار کی طرح ذہانت کا معیار بھی بدلتا رہتا ہے۔ کبھی بہت زیادہ اور کبھی بہت کم۔ اگر وہ ایک وقت میں اپنی کسی چھوٹی سی بری حرکت کو

نہایت شدت کے ساتھ بڑھا چڑھا کہ محسوس کر رہا ہوتا ہے تو کبھی بہت بڑی برائی کو اتنے چھوٹے پیمانے سے ناپ رہا ہوتا ہے کہ وہ برائی دکھائی ہی نہیں دیتی اور پھر اس کے ساتھ ہی ساتھ ذہانت کا بُوتا تو اور بھی غضب ڈھاتا ہے یعنی برائی کو خوبی میں بدلنے اور خوبی کو برائی میں پیش کرنے کے لیے اس کا کامیاب حربہ بن جاتا ہے اور سننے اور دیکھنے والا بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ خطرناک حد تک شریف اور شریفانہ حد تک خطرناک روپ دھار لیتا ہے۔

لیکن اس کا یہ روپ ہر دم اس کے ذہن پر سوار نہیں رہتا بلکہ کبھی کبھار جلوہ دکھاتا ہے۔ ورنہ عام حالات میں آپ اس سے ملیں تو سیدھا سادا سا سماجی آداب کا گرفتار اور رسوم و قیود کا پابند آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اسی لیے تو وہ دنیا میں اپنا دشمن بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ویسے میں نے اس کی زندگی میں سیکڑوں مرتبہ دشمن آتے، بنتے اور بگڑتے دیکھے ہیں۔ لیکن یہ دشمن پانی کے بلبلے کی طرح ہمیشہ اپنی کوتاہی عمر کا رونا روتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ اور انھیں مخمور کا دشمن بن کر ہمیشہ اپنی سادگی، حماقت اور ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ میں خود کئی مرتبہ اس کی ذات سے برافروختہ ہو جاتا رہا ہوں۔ اور بسا اوقات تو اس برافروختگی کو دشمنی کی حد تک لے جانے کے متعلق بھی سوچتا رہا ہوں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے (اُس لمحے میں چاہے مخمور مرے سامنے ہو یا نہ ہو) اپنی برافروختگی سے زیادہ مجھے اس اندازِ نظر پر رشک آنے لگتا ہے جس کی فضا میں مخمور اپنی زندگی بسر کر رہا ہے۔ کاش یہ اندازِ نظر ہر انسان کو راس آسکتا۔ رشک کا یہ تصور آتے ہی برافروختگی اور دشمنی تو خیر کہاں رہتی ہے۔ اُلٹا مجھ میں مخمور سے ملنے کی سیمابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جی چاہتا ہے اُسے جا کر کہوں آؤ مخمور! تم دو، چار، پانچ چھ گھنٹوں تک میرے ساتھ رہو۔ اور مجھے یہ سمجھنے کا موقع دو کہ تم نے پیار اور لطافت کا اتنا بڑا سرمایہ کیوں کر حاصل کیا۔ ہو سکتا ہے یہ سیمابی کیفیت اس کے ہر ملنے والے میں اس شدت

اور تیزی کے ساتھ نہ پیدا ہوتی ہو۔ لیکن وہ تڑپ ضرور پیدا کر دیتی ہے جو زندگی میں خلا کو پُر کرنے کے لیے جنم لیتی ہے کہیں کم کہیں زیادہ، لیکن شکل اس کی سیمابی ہی رہتی ہے۔

(۲)

وہ ایک متوسط درجے کے کھاتے پیتے گھر کا فرد ہے اس لیے روپے پیسے کی کمی کی شکایت کم کم محسوس ہوتی رہی ہے۔ پیسے کی فراوانی اور فطری ذہانت بچپن ہی سے اس کے ساتھ ساتھ چلنا شروع ہوئیں۔ اس لیے اس کی ذہانت کھلنڈری ہو گئی۔ زندگی کے جنسی تصور کا لذتی دور اوائل ہی میں اس کے ساتھ ہو لیا اور جب اس جنسی تصور میں شراب کی آمیزش ہوئی تو اس کی زندگی دو آتشہ تجربہ کی راہ پر چل کھڑی ہوئی۔ یہ تجربے عام سماجی نقطۂ نگاہ سے گردن زدنی قرار دیے جائیں گے۔ لیکن جب یہ تجربہ اپنی تکمیل کو پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ واضح اور براہ راست تکنیک کو عبور کر کے مخمور آج جس سماجی معیار کا مالک ہے۔ وہ کسی بھی اس معزز اور شریف اور سماجی اصول پرست انسان سے زیادہ بہتر معیار ہے۔ جو دزدانہ تکنیک کے ذریعے منزل تک پہنچتا ہے۔ "مخمور شراب پیتا ہے" "وہ حسن پرست ہے" "وہ جوا کھیلتا ہے"۔ لیکن جب اپنی انسانیت کی ایک ہلکی سی جھلک بھی دکھا دیتا ہے تو ماحول کے سارے دکھ کافور ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ دُکھ اُس دُکھ سے بہتر شکل کا دُکھ نہیں۔ جو انسانیت کے مکمل دعوے داروں کی طرف سے سماج پر مسلسل اور متواتر ٹھونسا جاتا ہے اور جس کے کاٹے کا علاج کبھی نہیں بتایا جاتا۔

جنس کے لذتی شعور اور شراب کی "حرام" مسرت کے ساتھ ساتھ اس میں شرافتِ نفس کی ایک وافر مقدار موجود ہے۔ یہ مقدار اسے اپنی خاندانی نجابت سے ورثہ میں ملی ہے۔ مخمور کے والد کو دیکھو تو اتنا محترم اتنا بزرگ اور اتنا متین شخص معلوم ہوتا ہے جسے دیکھ کر خواہ مخواہ جسم سکڑنے اور گھٹے گھٹے

رہنے کو جی چاہتا ہے اور ڈر لگتا ہے کہ اس کے سامنے اگر بھولے سے بھی کوئی غیر موزوں لفظ نکل گیا تو وہ خود شرم سے پسینہ پسینہ ہو جائے گا۔ کم و بیش یہی کیفیت مخمور کے سامنے بھی قائم رہتی ہے اگرچہ دوستانہ بے تکلفی اور شراب و جنس کی رنگین بے ساختگی میں متانت اور سنجیدگی کا وہ رنگ قائم نہیں رہنے دیا۔ لیکن اس کے باوجود مخمور کے سامنے جسم سکیڑنے کی ہلکی سی کیفیت ضرور طاری رہتی ہے بظاہر شراب اور عورت کے دل دادہ شخص میں نجابت اور شرافت کا یہ عنصر ٹاٹ میں مخمل کا پیوند معلوم ہوتا ہے اور اکثر تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ ایسا شخص بلند ترین سماجی، اخلاقی انداز کا حامل بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن مخمور کے معاملہ میں ایسا ہے اور ایسا رہے گا۔ اور اسی لیے اسے اس کا والد اس سے مسلسل شاکی رہنے کے باوجود اُسے اپنے پیار کے گوشے سے نہیں نکال سکتا۔ یہ باپ اور بیٹے کی روایتی محبت کی وجہ سے نہیں بلکہ مخمور کے کردار کی جان دار اور پر اثر تعمیر کا نتیجہ ہے نہ صرف اس کا باپ بلکہ اس کی بیوی، ماں، رشتہ دار، بھائی، مالک، نوکر، دشمن اور دوسرے سبھی مجبور ہو جاتے ہیں کہ مخمور ان کے جس پیار کے گوشے میں بیٹھا ہوا ہے وہاں سے اسے نکالنا اپنے آپ میں ندامت پیدا کرنے کے مترادف ہے۔

کالج کی ادھوری تعلیم چھڑوا کر گھر والوں نے اس کی شخصیت کو سماجی حیثیت دینے کی جدوجہد شروع کر دی۔ اور اسے بمبئی بھیج دیا۔ تاکہ مخمور جالندھری ریڈیو انجینیر بن کر لوٹے، اور یہاں لوٹ کر ایک شریف گرہستی کی سی زندگی شروع کر دے۔ موجودہ بورژوا نظام میں پلے ہوئے ہر نوجوان کی طرح مخمور کا مطالعہ بھی غلط زاویے سے کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ریڈیو انجینیر نہ بن سکا۔ بلکہ دو سال تک بمبئی میں رہ کر شاہد و شراب کے راستے سے اس نے تجربات کرنے شروع کر دیے۔ یہ تجربات اس کی زندگی کا حاصل ہیں، آپ اس کے پاس بیٹھیے وہ بلا کم و کاست آپ کو بمبئی کی یہ رنگین داستانیں سنا دے گا۔ اور نہایت لہکتے ہوئے لذیذ انداز میں، اور پھر یہ داستانیں کہتے کہتے وہ کھو جائے گا اور

آپ یوں محسوس کریں گے جیسے صرف مخمور ہی نہیں بلکہ آپ بھی بمبئی میں ہی بیٹھے رنگ و نور سے اخذ لذت کر رہے ہیں۔

اور پھر یہی نہیں کہ ان تجربات نے اس کے آرٹ کو اس کی شاعری کو منفرد انداز سے پنپنے میں مدد دی ہے۔ اور بمبئی کی کھوکھلی اور مصنوعی زندگی کی تلخیوں اور گھناؤنے پن اور غلاظتوں کو اجاگر کرنے کے لیے ایک شاعر دیا ہے۔ وہ ایک پیتی بورژوا ماحول میں پل کر بھی، اپنی زندگی کو رنگ و نور میں سمو کر بھی اپنی انسانیت نواز نگاہ کو صحیح و سالم بچاتا رہا ہے گرد و پیش کے نظام اور اس کے نتائج پر کڑھتا رہا ہے۔ اقتصاد کے شکار لوگوں کے لیے آنسو بہاتا رہا ہے۔ طنز کرتا رہا ہے۔ زہر آلود قہقہے لگاتا رہا ہے۔ جب اس کے پاس گھر سے ماہانہ روپے بمبئی میں پہنچتے ہیں اور وہ ان سے ایک عورت کے جسم کو خریدتا ہے تو اس تجربہ کو پورے طبقاتی کردار پر پھیلا کر اس نظم کی تخلیق بھی کرتا ہے جو موجودہ نظام کے "مول تول والے" عشق کی غمازی کرتا ہے وہ اپنے کردار میں طبقاتی کردار کا عکس دیکھتا ہے۔ اور اس عکس کو خلوص کے ساتھ دنیا کے سامنے ننگی شکل میں پیش کر دیتا ہے۔

ریڈیو انجینیری میں "ناکام" ہونے کے بعد اسے پھر کئی مرتبہ "شریفانہ" حیثیت دینے کی کوشش کی گئی۔ کبھی ملٹری کی کینٹین کے ٹھیکے دار کے روپ میں، کبھی موٹر کے پرزے سپلائی کرنے والے دکان دار کی شکل میں اور کبھی بیکری کے مالک کی صورت میں۔ لیکن وہ ہر جگہ سے ریڈیو انجینیر کی طرح "ناکام" ہوا۔ کیوں کہ یہ راستہ اس کا اپنا راستہ نہیں تھا۔ یہ تو صریحاً ناکامی کا راستہ تھا۔ اس پر چل کر مخمور ناکام نہ رہتا۔ تو کامیاب بھی کیوں ہوتا اور پھر اس ناکامی پر خاندان بھر کی طعن و تشنیع کے بے کار تیروں کا شکار ہونا کیوں برداشت کرتا رہتا۔ وہ تو ایک آرٹسٹ تھا۔ اور اگر وہ ان خشک سماجی افعال میں منھ کے بل گرا تو اس میں اس کا کیا قصور تھا۔

"کاش! میرے پاس بھی ٹالسٹائی جتنی ایک جاگیر ہوتی" وہ ارمان بھرے لہجہ میں کہتا ہے اور میں پھر ایک War & Peace کی تخلیق کرتا۔ لکھتا، لکھتا لکھتا ہی رہتا۔ متواتر، مسلسل۔ موجودہ حرام زدگیوں پر، نظام کی ذلتوں پر، ماحول کی گندگیوں پر۔

لیکن وہ جاگیردار نہیں ہے۔ بلکہ ایک عام متوسط گھرانے کا فرد ہے اس لیے اس کی ٹالسٹائی بننے کی خواہش تو کبھی پوری نہیں ہوسکی۔ لیکن اس نے اتنا ضرور کیا ہے کہ ٹالسٹائی کے مشہور عالم ناول "وار اینڈ پیس" کا اردو ترجمہ ضرور کر دیا ہے۔ اتنے بڑے ضخیم ناول کا ترجمہ کرنے کے لیے ایک بہت بڑا کلیجہ چاہیے اور رجب مخمور نے یہ ترجمہ مکمل کیا۔ تو اشتراکی ادیب باری نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اور مخمور نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ باری کی حیرت زدہ آنکھوں کو جواب دیا تھا کہ ہاں میں نے "وار اینڈ پیس" کا ترجمہ مکمل کر لیا ہے۔

وہ بہت محنتی ہے۔ کام کرنے کی جتنی طاقت میں نے مخمور میں دیکھی۔ اُس دور کے بہت کم ادیبوں میں دیکھی ہے۔ مخمور جب کام کرنے کے روپ میں آتا ہے تو اسے سر پیر کا ہوش نہیں رہتا۔ شاہد و شراب اضافی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں اور پھر وہ لکھتا چلا جاتا ہے۔ پیہم، متواتر، میں کئی بار سوچتا ہوں کہ کاش یہ شخص غیر ملکی زبانوں کے ترجموں اور نظموں کے بجائے نثری تخلیق کیا کرتا تو جاگیردار نہ ہونے کے باوجود اتنا کچھ لکھ جاتا کہ اس کے ارمانوں کی تکمیل ہو جاتی۔ میرا خیال ہے وہ مترجم کے بجائے خلاق قوتوں کا مالک زیادہ ہے۔

اس کے دوستوں کا حلقہ بڑا عجیب و غریب ہے۔ خاندانی طور پر وہ سکھ ہے۔ شباہت کے اعتبار سے ہندو ہے اس کے دوست مسلمان اور عیسائی ہیں گویا وہ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی کے مشہور عالم اتحادی فامولے کا عملی ثبوت ہے۔ غریب سے غریب عیسائی بھی اور امیر سے امیر عیسائی بھی۔ بدمعاش

اور لفنگا عیسائی بھی، شریف اور معزز عیسائی بھی۔ رشوت خور انسپکٹر بھی۔ ٹانگہ میکر شرابی سکھ بھی۔ تعلیم یافتہ اور فلسفی قسم کا مسلمان بھی اور بورژوا ترین سیٹھ بھی تمام اس کے حلقۂ رفاقت میں آجاتے ہیں اور وہ سبھوں کے ساتھ ان کے تفکرا ور تربیت کے مطابق گفتگو کرتا ہے۔ ہنستا کھیلتا ہے۔ قہقہے لگاتا ہے۔ تاش کھیلتا ہے اور انھیں دوستی کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ دوستی کو پرکھنے کے لیے اس کے پاس ایک مجرب آلہ ہے۔ شراب کا گھونٹ ــــ "شراب کا پیگ حلق سے اترتے ہی انسان کو اس کے پورے کردار کے ساتھ ننگا کر دیتا ہے" وہ کہتا ہے۔ اور پھر میں نے دیکھا ہے کہ شراب پی کر بھی مخمور اپنے ذہانت آمیز تجسس کو نہیں مرنے دیتا۔ ہر دوست کے ساتھ اس کی سطح پر آکر گفتگو کرتا ہے۔ رنڈی بازی، چوری، غنڈہ گردی، فلسفہ، ادب، منطق، عورت، عشق، حُسن، تمام موضوعات پر دوستوں کے ننگے کردار کو رقص کراتا ہے اور اکثر و بیشتر نتائج اخذ کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ کئی ایک دوست منھ کے بل گر تے ہیں۔ کئی ایک لڑکھڑاتے رہ جاتے ہیں۔ کئی ایک خاموش ہوجاتے ہیں۔ کئی ایک بدستور کھڑے رہتے ہیں اور کئی ایک اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اور پھر مخمور نہ صرف انھیں معاف کر دیتا ہے بلکہ کمزوریوں کے ان انکشافات پر وہ ہلکا ہلکا سرور بھی حاصل کرتا ہے۔ دل ہی دل میں مسکراتا ہے اور پھر انھیں ایک اور پیگ پیش کر کے کہتا ہے۔ پیو دوست پیو! تمھیں زندگی نے اتنا گھناؤنا، اتنا کھوکھلا، اتنا متضاد اور اتنا چور بنا دیا ہے۔ تو اس میں تمھارا کیا قصور ہے؟

ہر انسان کی طرح مخمور میں کمزوریاں بھی موجود ہیں۔ عام طور پر یہ سیدھی سادھی کمزوریاں ہوتی ہیں ان میں کوئی الجھن یا ایچ پیچ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ہر ملاقاتی سے جلد گھل مل جاتا ہے اس پر اعتماد کرنے لگ جاتا ہے۔ اُسے اپنی آتما کے ایک حصہ میں جگہ دے دیتا ہے۔ اس کی حرکات دیکھتا ہے اور پھر انھیں اپنی فطری نجابت کی کسوٹی پر پرکھ کر اسے طرح دیتا رہتا ہے اور جب

طوفان حد سے گزر جائے تو جھلاہٹ سے ملتا جلتا احتجاج بھی کرتا ہے لیکن اس احتجاج کی عمر اتنی کم رکھتا ہے کہ احتجاج احتجاج نہیں رہتا محبوب قسم کی ڈانٹ بن کر رہ جاتا ہے۔ دو چار ملنے والے اس کے کسی دوست کے متعلق یہ کہہ دیں کہ اس نے فلاں اخلاقی لحاظ سے گری ہوئی حرکت کی ہے تو مخمور کا اعتمادی مادّہ دوستوں کے فیصلے کو شدت کا رنگ دے دیتا ہے اور پھر ردِعمل طوفان کی صورت اختیار کر جاتا ہے اور جب یہ طوفان جا کر ٹکراتا اور ٹکرا کر لوٹ آتا ہے تو مخمور کا ندامت اور سادگی آمیز خجل دیکھنے کے قابل ہوتا ہے "کاش! وہ دوستوں کے غلط فیصلے کو طوفانی شکل نہ دے دیتا" وہ پچھتانے لگتا ہے۔ اور یہی پچھتاوا ہی مخمور کو عظیم بناتا رہتا ہے۔ اتنا باشعور انسان اس قدر سادگی کے طلسم میں گرفتار ہو کر موجودہ بورژوا دور کے اس نظریے کو جھٹلا دیتا ہے کہ ایک غلطی کو چھپانے کے لیے دوسری غلطی کر ڈالو۔ اور پھر تیسری اور پھر چوتھی۔ وہ غلطیوں کے اس الجھے ہوئے تسلسل میں پھنسنا نہیں چاہتا۔ بلکہ سپاٹ رہنا چاہتا ہے۔ دنیا اس کی سادگی اور شعور کے اس امتزاج کو کمزوری سے تعبیر کرتی ہے۔ لیکن سادگی اور شعور کا یہی امتزاج ہی اس کی عظمت کی دلیل ہے۔ جو اس دور کے بہت کم لوگوں کو میسّر ہے۔

اسے اپنی ہر کمزوری کا احساس ہے اور بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اس کی کمزوری کا فائدہ اٹھانے والے دوست ناجائز اور قابل ملامت حد تک بھی چلے جاتے ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے کہا ہے وہ اس ملامت آمیز اور قابلِ نفرت رویے کے خلاف سخت احتجاج بھی کرتا ہے لیکن اُف! مخمور انتقام بھی تو پوری دلچسپی اور دل جمعی سے نہیں لے سکتا اتنا ادھورا انتقام جس کے بعد اسے اکثر خود شرم آجاتی ہے۔ اور وہ پسینہ پسینہ ہو جاتا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا انتقام کیا لیتا ہوگا۔

وہ ایک وسیع ترین انسانیت کی تڑپ ہمیشہ اپنے دل میں سنبھالے

رہتا ہے۔ سکھ ہو کر سگریٹ پیتا ہے۔ شفیق مرزا جو ایک کٹر فرقہ پرست باپ کا بیٹا تھا اسے اپنا دوست بناتا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کے دنوں میں اُس نے اپنے مسلمان دوستوں کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی۔ اور جب فسادی غنڈوں کا ایک ٹولہ اس کے گھر پر حملہ کرنے کے لیے آجاتا ہے کہ اس نے مسلمانوں کو کیوں چھپا رکھا ہے تو وہ اس نازک دور میں بھی اپنے پائے استقامت میں لغزش نہیں آنے دیتا اور پامردی کے ساتھ فسادیوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ مسلم رفیوجی کیمپ میں فاقہ زدہ مسلمانوں کو اپنے گھر سے آٹا، تیل، دالیں، سبزیاں اور گھی پہنچاتا ہے۔ اور "غدار" کہلوا کر دنیا کو اپنی انسانیت پرستی کی عظمت کا قائل کراتا ہے۔

آج کل وہ ایک عام گرہستی انسان کی طرح ایک بیوی اور تین بچوں کا مالک ہے۔ اس ملکیت پر اسے کبھی خوشی نہیں ہوئی۔ کیوں کہ گھریلو پابندیاں اس کی زندگی کی مخصوص تکنیک کے ساتھ ہمیشہ ٹکراتی رہتی ہیں۔ "ایک آرٹسٹ کو کبھی شادی کے جھنجھٹ میں نہ پھنسنا چاہیے" وہ ہمیشہ کہتا ہوا سنائی دے گا۔ اور پھر اس کے ثبوت میں دنیا کے بڑے بڑے آرٹسٹوں کی تلخ گرہستی زندگی کی مثالیں دینے لگے گا۔ لیکن ان مثالوں سے اب کیا بن سکتا ہے۔ وہ ایک تلخ گرہستی زندگی گزار رہا ہے اور اس سے مفر اختیار نہیں کر سکتا۔ زیادہ سے زیادہ بڑے بڑے آرٹسٹوں کی مثالوں میں مخمور کی ایک اور مثال بھی شامل ہو سکتی ہے گھر میں وہ بیوی سے شاکی رہے یا بیوی اس سے شاکی رہے وہ اس طبقاتی چکر سے رہائی حاصل نہیں کر سکا۔ کیوں کہ آرٹسٹک بغاوت پر ہمیشہ اس کی طبقاتی فطرت فتح پا جاتی ہے اور پھر وہ گھر کے لیے سودا سلف خریدتا ہوا دیکھا جاتا ہے۔ بیوی کو سنیما دکھانے کے لیے جا رہا ہوتا ہے۔ بچوں کے لیے بوٹ خرید رہا ہوتا ہے اور اپنی خاندانی زندگی کو مصنوعی مسرت دے کر متوازن کر رہا ہوتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ اس سے کمتر اور حقیر لوگوں نے

اپنی زندگی کو انتہائی خوش حال بنا رکھا ہے تو وہ حیرت میں نہیں آتا۔ کیوں کہ اُسے ماحول کی کمینگی کا مکمل شعور رہے۔ اس سماج میں چھوٹے سے لے کر بڑا ہر آدمی کمینگی کے بوتے پر زندگی کو آگے بڑھائے جا رہا ہے۔ وہ بوٹ پالش والے بھیا کو یہ وعدہ لے کر ادھار دے دیتا ہے کہ وہ کل اسے واپس دے دے گا۔ لیکن اس وعدے کے نتیجے سے وہ بے خبر نہیں ہوتا۔ کیوں کہ بوٹ پالش کرنے والے کو بھی ماحول نے کمینگی پر مجبور کر رکھا ہے۔ اس لیے مخمور جانتا ہے کہ وہ ایک روپیہ واپس کرنے کی خواہش کو سینے میں زور سے دبانے پر بھی مجبور بنا رہے گا۔ اور کبھی نہیں لوٹائے گا۔

آج کل وہ جالندھر ریڈیو اسٹیشن میں ایک قلیل مشاہرہ پر اپنی قوتِ کار بیچ رہا ہے۔ اس قدر قلیل مشاہرہ پر اس نے اپنی زندگی کو آج تک نہیں بیچا تھا۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ اس ہچکولے کھاتے ہوئے دور میں ایک آرٹسٹ کو بھوکا مارنے کا اس سے زیادہ موزوں طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ دولت کی غلط تقسیم نے مخمور جالندھری کو ان آدمیوں کا غلام بنا رکھا ہے جو ایک سطر تک صحیح نہیں لکھ سکتے۔ اور صحیح سطر لکھوانے کے لیے اپنے "غلام" مخمور جالندھری کی منتیں سماجتیں کرتے ہیں۔ اور وہ طنزیہ انداز میں اُس صحیح سطر کا معاوضہ "کیپسٹن کی ایک ڈبیہ" کی صورت میں وصول کر کے آرٹ کی اس بے ڈھب قدر و قیمت پر مسکرا دیتا ہے۔ ریڈیو کے "بڑے صاحب" کا نزدیکی دوست ہونے کے باوجود ریڈیو اسٹیشن کے چھوٹے طبقہ کی انجمن کا سکریٹری ہے۔ اور ان کے مسائل کو اپنے مسائل سمجھ کر عوامی فن کار ہونے کا ثبوت بہم پہنچاتا رہتا ہے۔ صبح نو بجے سے شام کے پانچ بجے تک کولھو کے بیل کی طرح خدمتِ سرکار بجالاتا ہے اردو کا ادیب ہونے کے باوجود پنجابی زبان میں ڈرامے لکھتا ہے۔ نظمیں لکھتا ہے۔ کیوں کہ اردو کو گردن زدنی قرار دیا جا چکا ہے اور زندگی ابھی مری نہیں، وہ گندم مانگتی ہے، گھی مانگتی ہے، کپڑا مانگتی ہے اور یہ مانگیں پنجابی ڈرامہ اور پنجابی نظم

ہی پورا کر سکتی ہے اس لیے وہ زندہ رہنے کے لیے یہ ادب پارے تخلیق کرتا ہے
تاکہ وہ کچھ دن اور جی سکے۔ کچھ دن اور یہ ظلم سہہ سکے تاآں کہ ظلم کی میعاد کی "رات"
ختم ہو کر ایک خوش گوار صبح میں بدل جائے۔

وہ کبھی کبھی اس تلخ زندگی سے گھبرا کر کہیں بھاگ جانا چاہتا ہے۔ بمبئی، نیپال،
بھوٹان، تبت، کشمیر یا کسی ایسی جگہ جہاں وہ یا تو غلیظ زندگی میں پورے طور پر
ڈوب جائے۔ اور پھر یا ایسی جگہ جہاں وہ ایک بہت بڑا ناول لکھ سکے۔ اتنا
ضخیم اور عظیم ناول ــــ جو ہندستان کی پوری پانچ ہزار سال کی تاریخ کا احاطہ کیے
ہوئے ہو۔ اور پھر وہ اس ناول میں پے بہ پے کوڑے لگائے۔ موجودہ نظام
پر، طبقاتی کش مکش میں پھنستی ہوئی سماج پر ــ "یہ ناول ٹالسٹائی کے ناول سے
بڑھ کر ہونا چاہیے۔ فکر بھائی!" وہ کہتا ہے۔

شاید مخمور کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔ کیوں کہ ٹالسٹائی کے پاس
زندگی چلانے کے لیے جاگیر تھی۔ لیکن مخمور کے پاس ایک قلیل ماہانہ مشاہرہ ہے جو
اس کی بیوی اور تین بچوں کا مشکل سے کفیل ہو سکتا ہے۔

اور اسی لیے وہ عوامی جدوجہد میں کودنے کی بے پناہ خواہش رکھنے کے
باوجود نہیں کود سکتا۔ کیوں کہ وہ ایک ایسے طبقے سے بندھا ہوا ہے جس نے اس کے
کردار کے انقلابی پہلو کو دبا دبا کر بے حس کر دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

لیکن مجھے یقین ہے، کہ عوام کی انقلابی تحریک کسی نہ کسی اسٹیج پر جا کر مخمور
کے اس تذبذب کو ختم کر دے گی۔ جس نے اس کے نظریہ اور عمل کے درمیان
ایک کولاہل سا مچا رکھا ہے۔

(خدوخال میں سے)

مکانوں کے نمبر

میں نے مکان نمبر سی۔ پانچ سو چار کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہاں ایک صاحب نے مجھے ڈنر پر بلایا تھا۔ یہ صاحب شاعری بھی کرتے تھے اور سکوٹروں کی بلیک مارکٹنگ بھی۔ مگر مجھے انھوں نے شاعری کے سلسلے میں دعوت دی تھی — شاعری میری کمزوری تھی اور بلیک مارکٹنگ ان کی۔

کھٹ کھٹ سن کر ایک محترمہ برآمد ہوئیں (بالکل غزل مسلسل معلوم دے رہی تھیں) میں نے عرض کیا۔ گرَ دور صاحب تشریف رکھتے ہیں؟

وہ مصرع طرح گنگناتے ہوئے بولیں — یہاں کوئی گرَ دور صاحب تشریف نہیں رکھتے۔ یہ رستوگی جی کا مکان ہے۔

میں نے رستوگی جی کی خوش نصیبی پر رال ٹپکائی جو اس حسین غزل میں تخلص کے طور پر لگا ہوا تھا۔ اور پوچھا — "کیا یہ مکان نمبر سی۔ پانچ سو چار نہیں ہے۔

"جی نہیں۔ یہ مکان نمبر سی بٹہ دو، پانچ سو چار ہے۔

سوری! میں نے آپ کو خواہ مخواہ ڈسٹرب کیا۔ حالاں کہ جی چاہتا تھا کہ گرَ دور کا مکان مجھے ملے یا نہ ملے لیکن اس قتالہ کو اسی طرح ڈسٹرب کیے جاؤں۔ لیکن وہ جلدی سے کواڑ بند کر کے چلی گئی۔ اور اپنے پیچھے اپنا دل کش آہنگ اور میری حسرتیں چھوڑ گئی۔

میں آگے بڑھ گیا۔ سی بٹہ دو کی پوری قطار طے کر ڈالی۔ پھر سی بٹہ تین،

پھر سی بٹہ چار۔ مگر خالص سی کہیں ملا ہی نہیں۔ ایک دو آدمیوں سے پوچھا بھی کسی نے بتایا کہ سی بلاک اس کالونی کے شروع ہوتے ہی گندے نالے کے پاس ہے۔ کسی نے شرمندہ کرتے ہوئے کہا۔ سی بلاک تو اس کالونی میں ہے ہی نہیں۔

ایک صاحب نے جو شاید ایک ریٹائرڈ بوڑھا تھا اور سوائے نشکام سیوا کے اُسے اور کوئی کام نہیں رہا تھا۔ میرے کاندھے پر شفقت بھری تھپکی دیتے ہوئے بولا۔ آپ کون سی کالونی میں یہ مکان ڈھونڈنے کے لیے نکلے ہیں؟

"سیتا کالونی میں"۔

مگر یہ تو سبیتا کالونی ہے۔ اور سیتا اور سبیتا دو الگ الگ عورتوں کے نام تھے۔ ہاں یاد آیا، سبیتا کالونی میں واقعی ایک سی بلاک موجود ہے۔ آپ وہاں جا کر معلوم کیجیے

"سبیتا کالونی کہاں ہے؟"

"جہاں سیتا کالونی ختم ہوتی ہے۔ سبیتا کالونی شروع ہو جاتی ہے"!

اور اب یہ مت پوچھیے کہ سیتا کالونی کہاں ختم ہوئی، ختم ہوئی بھی کہ نہیں اور سبیتا کالونی شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ تو اس کا ایکس ٹینشن ایریا ہے۔ پرانی سبیتا کالونی ان کھنڈروں کے پاس ہے جنھیں مغل بادشاہ اپنے زوال کی نشانی کے طور پر چھوڑ گئے تھے۔ بہر کیف میں بھی بے حد ڈھیٹ ثابت ہوا۔ اور آخر جوئندہ یابندہ، سی بلاک تلاش کر ہی لیا۔ اور جب سی نمبر پانچ سو تین والے مکان تک پہنچا تو بلاک ختم ہو گیا۔ وہ سی بلاک کا آخری مکان تھا۔ اور مجھے مکان نمبر پانچ سو چار چاہیے تھا۔

میں نے پھر ایک صاحب سے پوچھا۔" یہ مکان نمبر پانچ سو چار کہاں پر واقع ہوگا جناب!"

جناب نے اطلاع دی۔ اس سی بلاک کا بقیہ حصہ ڈی بلاک کے عقب میں بنا ہوا ہے۔ پانچ سو کے بعد کے نمبر وہاں سے شروع ہوتے ہیں۔

اور وہ بقیہ حصہ اصل سی بلاک سے تین فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔

شاید ستاروں کی چال میرے ساتھ تھی۔ یا میں نے پچھلے جنم میں کسی اندھے فقیر کو سڑک پار کرائی تھی۔ کہ میں واقعی مکان نمبر سی۔ پانچ سو چار کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مکان سے ایک محترمہ باہر نکلیں۔ (کافی بے وزن شعر معلوم دے رہی تھیں)۔ میں نے پوچھا۔ گردور صاحب تشریف رکھتے ہیں؟

"جی نہیں۔ وہ سی پانچ سو آٹھ والے گردور صاحب کے ہمراہ تھانے تک گئے ہیں۔ ان کا مالک مکان کے ساتھ جھگڑا ہو گیا تھا اسے ذرا سلجھانے گئے ہیں۔"

"مگر جی! مجھے انھوں نے ڈنر پر بلایا تھا۔"

"ہاں، ہاں۔ وہ سی پانچ سو دس والے سے کہہ تو رہے تھے کہ آج میرے گھر میں ایک بہت بڑا ادیب کھانے پر آ رہا ہے، اندر تشریف لائیے۔ میں نے سی پانچ سو ایک والے کے لڑکے کو مچھلی لانے کے لیے بھیج دیا ہے۔ ان کی واپسی تک ڈنر تیار ہو جائے گا۔"

اور مجھے مچھلی اور تھانے سے زیادہ اس بات میں دلچسپی ہونے لگی کہ ہم ماڈرن زمانے کے انسان اپنے نام سے نہیں پہچانے جاتے بلکہ مکان کے نمبروں سے پہچانے جاتے ہیں۔ جیسے ہم انسان نہیں ہیں مکان ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ سامنے گردور صاحب کھڑے ہیں۔ بلکہ یہ کہ مکان نمبر سی پانچ سو چار والے کھڑے ہیں۔ انھیں مکان سی پانچ والے نے دھمکی دی ہے کہ اگر آپ نے سی چھ والے کے حق میں گواہی دی تو سی سات والا اپنے سی آٹھ والے بہنوئی کو لے کر سی دس والے کے پاس شکایت لے کر پہنچ جائے گا اور سارے بلاک میں آپ کی تھڑی تھڑی ہو جائے گی۔

ہاں۔ یہ ہم نئے زمانے میں سانس لینے والے انسانوں کی پرابلم ہے کہ آپ کسی انسان کا نام لیں۔ تو آپ کے ذہن میں اس نام سے کوئی چہرہ

نہیں ابھرتا۔ لیکن مکان کا نمبر پکاریں۔ تو وہاں رہنے والے کی تصویر ابھر آتی ہے۔ کہ اچھا وہ صاحب جن کی ناک پکوڑا سی ہے اور اگلا ایک دانت ٹوٹا ہوا ہے۔ اس کا نام گردور ہے۔ مگر صرف گردو کہنے سے خدوخال نہیں بنتے کیوں کہ مکان نمبر سی پانچ سو چار میں بھی گردور رہتا ہے اور سی پانچ سو آٹھ میں بھی اور پندرہ میں بھی۔ اس لیے پندرہ نمبر مکان کا گردور الگ ہوگا۔ یعنی وہ اپر ڈویزن کلرک ہوگا۔ مگر دس نمبر مکان والا گردور ناجائز چرس کا دھندا کرتا ہوگا۔

غرض ہمارا اصلی کیرکٹر مکان کے نمبر کے ساتھ مخصوص ہے نام کے ساتھ نہیں۔

اور پھر شاید سوشلزم وغیرہ لانے کے لیے نئی کالونیوں کے سبھی مکان ایک ہی ٹائپ کے بنائے گئے ہیں۔ کیونکہ مکان بناتے وقت اس پرانے شعر کو مدِنظر رکھا گیا کہ:

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری

مجھے یاد ہے۔ ایک مرتبہ میرے ایک پڑوسی کے گھر ڈاکیہ ٹیلی گرام دے گیا کہ آپ کے انکل انتقال فرما گئے ہیں۔ چنانچہ اس گھر میں رونے پیٹنے کے لیے ایک چادر بچھا دی گئی اور ماتم پرسی کرنے والوں کا انتظار کیا جانے لگا۔ آدھ گھنٹے تک دوہتھڑ پیٹے جانے کے بعد ڈاکیہ لوٹ آیا اور بولا معاف کیجیے۔ وہ تار مکان نمبر بی تراسی کا تھا مگر آپ کے مکان کا نمبر تو بی اکیاسی ہے۔ اور آپ کے نام کا تو ایک منی آرڈر ہے۔ غلطی سے منی آرڈر مکان نمبر بی تراسی کو دے آیا تھا۔

اور یوں انکل کے آنسو منی آرڈر کی مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئے۔ اور رونا دھونا مکان نمبر بی تراسی کی طرف منتقل ہو گیا۔

میں نے مشتعل ہو کر ڈاکیے سے پوچھا۔ "ایڈیٹ ؟ یہ فاش غلطی تم نے کیوں کی ؟"

وہ گڑگڑا کر بولا ـــ اجی کیا کریں ان مکانوں کے ڈیزائن اور رنگ روپ ایک جیسے لگتے ہیں ان کی الگ الگ کوئی پہچان ہی نہیں ہے سوائے نمبروں کے ۔ اور نمبر کم بخت بہت مدھم پڑ گئے ہیں۔ صحیح پڑھے ہی نہیں جاتے۔ مرنے والے کے گھر منی آرڈر پہنچ جاتے ہیں اور منی آرڈر والے کے گھر میں سیاپہ شروع ہو جاتا ہے ۔

(پیاز کے چھلکے)

منی بس

دہلی میں منی بسیں چلتی ہیں تو یوں لگتا ہے منی سکرٹ پہنے فلم "بوبی" کی ہیروئن چھوکری جارہی ہے اور تکمیل شوق کی دعوت دیتے ہوئے کہہ رہی ہے۔
"آؤ آؤ! تمھیں اپنے ساتھ لے چلوں۔ نظام الدین، بھوگل، لاجپت نگر۔"

اور جب آپ اپنی تمناؤں کی رال ٹپکاتے ہوئے۔ اس منی سکرٹ کا دامن پکڑتے ہیں اور بس میں داخل ہوجاتے ہیں تو آپ کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ خود داخل نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ کسی نے آپ کو بالوں سے پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا ہے۔ آپ چلا اٹھتے ہیں۔ "روکو بس میرا دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے باہر نکلنے دو۔"

اور کنڈکٹر جواب دے گا۔ "اب مشکل ہے صاحب! ہماری منی بس میں جو ایک بار اندر آگیا وہ نہ اندر کا رہا نہ باہر کا۔ نکالیے پیسے کہاں جانا ہے آپ کو؟"

"جہنم میں"

"تو ساٹھ پیسے نکالیے۔"

"مگر مجھے تو یہاں پاؤں ٹکانے کے لیے ایک انچ جگہ نہیں مل رہی۔ میں باہر نکلنا چاہتا ہوں۔"

"باہر جانے کی ٹکٹ بھی ساٹھ پیسے میں ملتی ہے۔ نکالیے ساٹھ پیسے۔"

اور آپ ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں اور خاموش ہوجاتے ہیں۔ ٹھنڈی سانس کو بھی نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ کیوں کہ منی سکرٹ کے کئی شیدائیوں نے

گیٹ کا گھیراؤ کر رکھا ہے۔ لہٰذا سانس شیدائیوں سے ٹکرا کر آپ کے پاس ہی لوٹ آتی ہے یا آپ کے قریب کھڑی سواری کے کندھے پر جا بیٹھتی ہے اور سواری کہتی ہے۔

"یہ کیا ہے؟"

"میرا ٹھنڈا سانس!"

"اوہ، میں سمجھا، کوئی مکھی ہے۔ دیکھیے اپنی چیز اپنے پاس ہی سنبھال کر رکھیے۔ دوسرے پر بوجھ مت ڈالیے۔ ورنہ میری ٹانگوں کا توازن بگڑ جائے گا، دیکھتے نہیں، میں کتنی کوشش سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے ہوں۔"

"کنڈکٹر! کنڈکٹر صاحب جی۔ مجھے اس بلیک ہول سے باہر جانے دو!" اور کنڈکٹر یعنی بوبی کی ہیروئن، منھ سے وسل بجا کر گنگنائے گی۔ "ہم تم، اِک کمرے میں بند ہوں اور چابی کھو جائے۔"

اور آپ مایوس ہو کر اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں گے۔ منی سکرٹ کے طول و عرض پر نگاہ دوڑائیں گے تو آپ کو ایک دم معلوم ہوگا کہ آپ کا ایک پاؤں۔ تو اس بوٹ پر رکھا ہے جو آپ کا نہیں ہے۔ تھوڑی سی تشریح کے بعد آپ کو بتایا جاتا ہے کہ یہ بوٹ ایک عینک والے بوڑھے کا ہے۔ مگر اس بوڑھے بوٹ کے نیچے تین بوٹ اور ہیں۔ جنھوں نے ایک دوسرے کے پاؤں کو اپنے لیے سیڑھی بنا لیا ہے۔ اور جو بوٹ سب سے نیچے ہے وہ ایک ڈیڑھ کوئنٹل وزن والی دیوی جی کا ہے اور حسرت سے کہہ رہا ہے ع

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

اور میرا دوسرا پاؤں کہاں ہے؟ آپ حیران ہو کر ارد گرد کھڑے لوگوں سے پوچھتے ہیں۔

"جی۔ وہ میری پتلون کے پائیچے کے ساتھ لٹک گیا ہے۔" ایک مہربان انسان آپ کو تسلی دیتا ہے۔

"مگر یہ میری گٹھری پر کس کا پاؤں ہے؟ میری گٹھری میں کیلے ہیں۔"
ایک ادھیڑ عمر دیہاتی نما شہری چلا اٹھتا ہے۔
پتلون کے پائینچے والے کے پاؤں نے اپنے نیچے کیلوں کا گداز جسم محسوس کیا تو پہلے دو سکنڈ کے لیے تو اپنے کو مجرم محسوس کیا۔ لیکن پھر آنکھیں پھیرلیں بلکہ آنکھیں بند کرلیں اور جیسے یادِ خدا میں مصروف ہوگیا۔
اتنے میں بس کو ایک جھٹکا سا لگا تو آپ کا ہاتھ جو بس کے ڈنڈے کی بجائے ایک نوجوان کی بغل میں دبائے ہوئے اخبار کو پکڑ کر اپنا سہارا بنائے ہوئے تھا ایک دم اخبار سے الگ ہولیا۔ اور وہ فارغ البال ہاتھ نیا سہارا ڈھونڈنے کے لیے جو ہوا میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگا تو ایک محترمہ کی ساڑھی کے پلو کو پکڑ لیا۔ جو اس محترمہ کے خاوند نے پکڑ رکھا تھا۔ چوں کہ ایک ساڑھی پر وہ ہاتھ ایسے تھے جیسے ایک میان میں دو تلواریں سمانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اس لیے خاوند نے دانت پیس کر کہا۔
"آپ کو شرم نہیں آتی!"
خاوند کو دانت پیسنے کی بجائے دراصل آپ کے منھ پر طمانچہ لگانا چاہیے تھا۔ لیکن طمانچہ والا ہاتھ منی بس کی چھت کو سنبھالنے میں مصروف تھا۔ اس لیے وہ ہاتھ طمانچہ بننے کے اہل نہیں رہا تھا۔ اگر طمانچہ بن جاتا تو خاوند صاحب خود بھی قریب والی ایک اور کالجیٹ حسینہ پر جا گرتے اور چھت ان پر گر جاتی۔ اور پھر کالجیٹ حسینہ کے پہلو میں اپنے آپ کو "ایڈجسٹ" کیے ہوئے اس کا ایک بوائے فرینڈ بھی کھڑا تھا جس کی بغل میں ایک ہاکی بھی تھی۔
آپ نے محترمہ کے خاوند سے کہا (آپ کا لہجہ شریفانہ اور مظلومانہ تھا)
"دیکھیے آپ کا یہ کہنا بجا ہے کہ مجھے شرم آنی چاہیے اور جواباً میرا یہ کہنا بھی بجا ہے کہ مجھے شرم آ رہی ہے۔ لیکن شرم اِن منی بس والوں کو آنی چاہیے جو ہمیں انسان نہیں بھیڑ بکریاں سمجھتے ہیں۔

اور آپ کو حالات کا شکار ہو کر واقعی شرم آگئی جو کسی حد تک جینوئن تھی کیوں کہ آپ نے سوچا کہ اگر یہ محترمہ میری بہن یا بیوی یا بیٹی ہوتی اور اس کی ساڑھی کا پلو کسی باگڑ بلے قسم کے جاٹ کے ہاتھ میں آجاتا تو ۔۔۔۔۔؟
اور آپ نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ جس سے توازن بگڑنے لگا۔ آپ پیچھے ہٹ گئے تاکہ اپنا ہاتھ منی بس کی بائیں دیوار سے ٹکا دیں۔ جہاں پہلے ہی کئی ہاتھ اپنی سلطنت قائم کیے ہوئے تھے۔

جوں ہی آپ پیچھے ہٹے تو ایک طفلانہ آواز آئی۔ "ڈیڈی! میری ٹوپی اس نیلے سوٹر والے نے نیچے گرا دی۔"

ڈیڈی ٹوپی اٹھانے کے لیے نیچے جھکا تو اس کا سر ایک اور سواری کی بغل میں جا گھسا بغل میں دو تین سر پہلے بھی گھسے ہوئے تھے۔ انھوں نے پروٹسٹ کیا "اے اے! کدھر بھاگا آتا ہے۔ یہ ہماری سرحد ہے۔ مائنڈ یور ارن سرحد!"

اور پھر ننھے کی ٹوپی پر ایک نیم فوجی قسم کا زبردست بوٹ آپڑا۔ اور ٹوپی کو گھسیٹتا ہوا گیٹ تک لے گیا۔ کیوں کہ ایک بس اسٹاپ آگیا تھا اور کنڈکٹر کہہ رہا تھا چلو انکم ٹیکس کا دفتر یعنی ہیرا پھیری کا دفتر۔ اور جیسے کمرے کی چابی مل گئی اور دروازہ کھل گیا۔ پندرہ بیس سواریاں نیچے اترنے کے لیے اور بیس پچیس سواریاں اوپر چڑھنے کے لیے ایک دوسرے پر چاند ماری کر رہی تھیں، بلکہ کئی سواریوں کو تو اس دھکا پیل میں یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ انھیں اترنا ہے یا چڑھنا ہے۔ اور اترنے اور چڑھنے والوں کے درمیان کنڈکٹر کا پل تھا۔ جو کہے جا رہا تھا "بغیر ٹکٹ کے جو اترے گا، اسے نگم بودھ گھاٹ لے جاؤں گا۔ ہم بے ایمانی نہیں چاہتے۔ پیسے چاہتے ہیں۔"

اور وہ ٹکٹیں کم کاٹ رہا تھا اور پیسے زیادہ لے رہا تھا۔ ایک سواری

ٹرنک لے کر اتر رہی تھی دوسری سواری ٹرنک لے کر چڑھ رہی تھی۔ دونوں ٹرنک میرے آمنے سامنے ہوئے تو دونوں ٹرنک آپس میں ٹکرا گئے۔ کنڈکٹر نے کھینچ کر ایک ٹرنک گرا دیا، ایک چڑھا دیا۔ اور پھر سیٹی دے دی۔ اور گانے لگا۔

"ہم تم ایک کمرے میں بند ہوں اور چابی کھو جائے"۔

اور دو منٹ بعد اچانک ٹرنک والی سواری چلائی "روکو روکو بس! میرا ٹرنک اس جانے والے سے بدل گیا ہے جو نیچے اتر گیا ہے۔

اتر پردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام شائع ہونے والے

دوسرے انتخابات

کتاب	مرتب	قیمت
انتخاب مرزا محمد ہادی رسوا	مرتبہ محمد حسن	۱۰/- روپے
انتخاب کلام یگانہ چنگیزی	" انیس اشفاق	۶/- "
انتخاب بستان حکمت فقیر محمد خاں گویا	" نیر مسعود	۴/- "
انتخاب منظومات نظیر اکبر آبادی	" مسعود حسین خاں	۴/- "
انتخاب جعفر علی خاں اثر	" کاظم علی خاں	زیر طبع
انتخاب مضامین احمد جمال پاشا	" عابد سہیل	۴/- روپے
انتخاب غبار خاطر		زیر طبع
انتخاب کلام جگر مرادآبادی	" ایم کوٹھاوی راہی	"

ملنے کا پتہ

اتر پردیش اردو اکادمی
۲۱- آر، کے ٹنڈن روڈ، قیصر باغ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

فکر تونسوی

۱۹۱۸—۱۹۸۷